نضیر اعظم
آشنا نا آشنا

آشنا نا آشنا

جملہ حقوق بحق مصنفہ

طبع اوّل ——— ۱۹۸۸ء

تعداد ——— ایک ہزار

کتابت ——— محمد سخی

ٹائیٹل ——— مسّرت ناہید امام

قیمت ——— ۵۰ روپے

رابطہ

رابطے کا پتہ

مکان نمبر ۱-C

ٹی-او-آر کالونی سیکٹر ۴/۷-G اسلام آباد

ان حوصلہ افزائیوں کے نام ------

جنہیں میرے شعور نے پاپا امی کا لقب دیا !

میری ماں نے مجھے رشتوں کی شناخت، اہمیت،
افادیت، قوت اور نزاکتوں سے آگاہ کیا ——

اور ——

میرے باپ کے عمل نے مجھے صرف ایک بات سکھائی
کہ. . . . . رشتے کیسے قائم رکھے جاتے ہیں!

فہرست

مضامین	صفحہ نمبر

دیباچہ

پہلا افسانہ اس وقت بے سان وگمان تخلیق ہوا جب بہار کی آمد آمد تھی۔ جذبوں میں انجانی سی کسک اتر آئی تھی اور پھر بہار اور کسک آشنا نا آشنا میں ڈھل گئی ـــــ میں سمجھتی ہوں کہ زندگی میں انسان خود کچھ نہیں کرتا بلکہ کر ہی نہیں سکتا ہے۔ یہ تو اس کے اردگرد کے حالات و واقعات اور افراد ہیں جو اسے زمانے میں ایک مقام دلاتے ہیں۔

اس کتاب کے منصۂ شہود پر آنے میں جہاں جذبوں اور کسک نے ہمنوائی کی، وہیں ان دونوں چیزوں کو کہانی کا روپ دینے میں صرف اور صرف میرے والد کا ہاتھ ہے جنہوں نے برسوں پہلے مجھے ادب کی طرف مائل کیا تھا، ادبی تحریروں پہ بحثیں کیں... باوجود اس کے کہ مجھے ان کی اس قسم کی خشک تقاریر کبھی نہیں بھائیں لیکن سعادتمندی احتجاج کو تھپک دیتی اور اگر اس وقت یہ نہ ہوتا اور احتجاج غالب آجاتا تو آج ذہن کو جو، تھوڑی بہت بالیدگی ملی ہے اس سے محروم رہ جاتی ـــــ اور اپنی بہت سی ساتھیوں کی طرح زندگی ایک لگے بندھے ڈھرے پر گذار رہی ہوتی، جہاں "نہ" کی طاقت نہ ہوتی اور صرف "ہاں" ہی سے آشنائی ہوتی اور میں بھی بہت سے قریبی دور کے رشتوں اور حوالوں میں الجھ کر اپنی شناخت اپنی ذات کے حوالے سے یکسر نابلد رہ جاتی۔

انسان خداوند تعالیٰ کی عجیب و غریب تخلیق ہے۔ کہیں ایک چھوٹے سے حصول کی خاطر

اسے آگ کا دریا عبور کرنا پڑتا ہے اور کہیں سب کچھ مل جانے کے بعد آگ کے دریا میں بھسم ہونا پڑتا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ سب کچھ ملنے سے بہتر ہے کسی چھوٹے مقصد کے لیے انسان آگ کے دریا میں اتر جائے کہ یہی چھوٹا مقصد کسی دن اسے بڑی منزل تک پہنچا دیتا ہے!

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں موجود ہے، یہ میرے اردگرد اور بے حد قریب کی سچائیاں ہیں۔ اس میں معاشرے کا جبر بھی ملے گا اور محبت کے روپ بھی۔ نرم و نازک جذبوں کو مصلحت اور منافقت کے کفن میں لپیٹنے کا عمل بھی اور چاہتوں کے انداز بھی۔ افسانوں کو یکجا کرنے کے بعد جو مجھ میں آیا وہ تجزیے کے طور پر چند سطروں میں بیان کر دیا ہے۔ آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں؟ ـــــ اس کا نقیب صرف وقت ہوگا ـــــ!

نضیر اعظم

نام تو اس کا محمد دین تھا مگر مِل کے تقریباً سارے ہی مزدور اسے مولبی یا مُلاّ کہہ کر بلاتے تھے اور یہ خطاب مِل میں آنے والے ایک مزدور رحیم نے دیا تھا ـــــ کیونکہ تمام مزدوروں میں صرف محمد دین ہی ایسا تھا جو پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتا تھا۔

شام ڈھلے جب تمام مزدور اپنی تکان اتارنے مِل کے پچھواڑے جوا کھیلتے شور و غل مچاتے۔ دھینگا مشتی کرتے تو ایسے میں محمد دین اپنی کوٹھڑی میں بیٹھا جانے کیا کیا پڑھا کرتا۔ رحیم یوں تو بڑا ہمدرد اور محنتی جوان تھا مگر اس کی ایک بات سے اس کے تمام ہی ساتھی خائف رہتے کہ وہ ہر دم جانے کیوں بات بے بات خدا کو بُرا بھلا کہا کرتا۔ ایک دن اس کے تمام دوستوں نے مشورہ کیا کہ اس طرح تو ان کا اتنا اچھا دوست جہنم میں چلا جائے گا کیوں نہ مولوی سے کہا جائے کہ اسے کسی طور سمجھائے۔

شام چھ بجے دن بھر کے تھکے ہارے مزدور اپنی مخصوص جگہ پر پہنچے تو محمد دین وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔

"چل بھائی ـــــ آج تو یہ اپنا مولبی بھی سدّھے رستے پر آگیا ـــــ آج تو اس کھُسی میں رات بھر جوا ہوگا !" ـــــ رحیم نے محمد دین کو وہاں دیکھ کر خوشی سے بھرپور نعرہ مارا۔

"لاحول ولاقوۃ —— کیا بک رہا ہے ۔ رحیم خدا سے ڈر خدا سے !" —— مولوی تڑپ کر بولا ۔

"لے بھلا کھدا سے کیوں ڈریں ؟ —— بھلا وہ کوئی چور ڈاکو ہے ؟" —— رحیم نے حیرت سے پوچھا ۔

"توبہ ! توبہ ! —— " مولوی نے اپنے کلّے پیٹ لئے پھر رحیم سے بولا —— "رحیمو کبھی میرے پاس بھی تو آکر بیٹھا کر ہر دم اودھم ہی مچایا کرتا ہے !"

"تیرے پاس کون سریپھ آدمی بیٹھے گا —— ہر دم تو تُو دوزخ جنت کی باتیں کیا کرتا ہے میرے یار کبھی کسی لونڈیا کی بھی تو کھبر لے !" —— رحیم ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے بولا ۔

"اصل میں تو نے خدا کو پہچانا نہیں ہے !"

"ارے واہ مولبی ! ۔ کیا بات کی ہے میرے پیارے ! —— جرا یہ تو بتا تیرا کھدا ہے کس سکل کا ؟ —— میری طرح کھوب صورت یا بانکے کی طرح چھیل چھبیلا —— دیکھ مولبی اگر کھدا کی سکل تیری طرح ہوئی نا —— تیلا سا لمبا سا منہ —— بکری کی سی داڑھی تو —— نہیں دیکھنا ہم کو —— ہاں !" —— رحیمو شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا ۔

"کیا بکتا ہے ملعون ؟" —— مولوی گرجا —— مگر چونکہ اسے رحیم کو راہِ راست پر لانا تھا اس لئے نرمی سے بولا ۔

"دیکھو رحیمو —— ایسی باتیں نہ کیا کر —— پہلے میری بات سن لے پھر جو جی میں آئے بولنا ۔"

"چل تو ہی کہہ لے —— کیا یاد کرے گا !" —— رحیم فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ۔ پھر اپنے سب ساتھیوں کو پلٹ کر پکارنے لگا ۔

"ابے —— جرا سب آجائیو ادھر کو ۔ آج تو یہ اپنا مولبی تکریر کرے گا !" ——

اور مولوی اس کی للکار سن کر ایکدم ہی گھبرا گیا —— سارے مزدور اپنا بلّا گلّا چھوڑ کر ان دونوں

کے گرد جمع ہونے لگے تھے ــــ کاہے کو کبھی مولوی کو اتنے بڑے مجمع سے خطاب کرنے کا موقع ملا ہوگا ــــ لیکن اس نے اپنی گھبراہٹ کو ظاہر نہیں ہونے دیا جب سارے مزدور جمع ہو گئے تو مولوی نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی اور کھنکھار کر بولنا شروع کیا۔

" میرے بھائیو! جیسے ایک گھر کو چلانے کے لئے ایک باپ ہوتا ہے، ایک ملک کو چلانے کے لئے ایک صدر یا بادشاہ ہوتا ہے ــــ بالکل ویسے ہی اس اتنی بڑی دنیا کو چلانے کے لئے ایک بہت بڑی طاقت ہے ــ جس کا نام خدا ہے ــــ وہ بہت رحم کرنے والا ہے ــــ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی ہل نہیں سکتا ــــ ہر کام اس کے حکم سے ہوتا ہے ــــ وہ ہم کو کھانے کو دیتا ہے ــــ وہ ماں باپ سے زیادہ رحم دل ہے ــــ ان سے زیادہ پیار کرنے والا ہے اور ـ ـ ـ اور ـ ـ ـ ـ ـ

" اچھا مولبی ایک بات تو بتا!" ــــ رحیم جو بغور اس کی باتیں سن رہا تھا ایکدم بول اٹھا۔

مولوی دل میں تو بہت خوش ہوا ــــ کیونکہ اس کے آگے خود اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ لیکن بہ ظاہر ڈانٹ کر بولا:

" دیکھ بیچ میں مت بولا کر ــــ خیر پوچھ کیا پوچھنا چاہ رہا تھا!"

" دیکھ مولبی تو نے کہا کہ کھدا ساری دنیا کا باپ ہے؟"

"ہاں!" ــــ مولوی بولا ــــ

" اور یہ کہ سارے کام اس کے حکم سے ہوتے ہیں؟"

" ہاں ــ ہاں!" ــ مولوی مسکرایا۔

" مولوی ایک بات سوچ رہا ہوں ــ تیری تو کھدا سے بہت یاری ہے ناں تو ایسا کر اپنے کھدا سے کہہ دے کہ بس چھ ایک مہینے کے لئے اس مل میں آن کر مجوری کر لے اور مجھے اپنی جگہ بھیج دے ــ لے یہ کون سا مسکل کام ہے ــــ آڈر تو ہم بھی دے

سکتے ہیں !" ــــ رحیم نے کہا ــــ

"کیا بک رہا ہے جہنمی ! ــــ زبان کو لگام دے !" ــــ مولوی کانپ کر دھاڑا۔

"واہ ! تو ہی تو کہتا ہے کہ اس کے حکم کے بگیر ایک پتّہ بھی ہل نہیں سکتا ــــ تو اب میں کیسے جبان کو لگام دوں ــــ اپنے کھدا سے کہہ کہ وہی دے لگام !" ــــ رحیم چمک کر بولا۔

سب لوگ سناٹے کے عالم میں بیٹھے تھے ــــ اور مولوی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رحیم کو کچا چبا جائے۔ دانت کٹکٹا کر بولا:

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تو سیدھا جہنم میں جلے گا ! .... اور ... اور اگر خدا کو غصہ آگیا تو تیری نوکری بھی ختم ہو جائے گی ..... بتا پھر کس طرح اپنی بہنوں کی شادیاں کرے گا ؟ ــــ کہاں سے پیسہ لائے گا ؟ ــــ مولوی کی یہ بات سن کر سارے مجمع پر ہُو کا عالم طاری ہو گیا ــــ سب ہی کو اپنی اپنی نوکری خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ رحیم بھی سر جھکائے کسی سوچ میں پڑ گیا۔ کیونکہ مولوی نے اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا ــــ مولوی نے ایک فاخرانہ نظر سب کے سہمے ہوتے چہروں پر ڈالی اور پھر کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ رحیم پھر بول پڑا۔

"تو نے یہ نہیں کہا کہ کھدا بہت رحم کرنے والا ہے !"

"ہاں ! ہاں کیوں نہیں !" ــــ مولوی بولا۔

"اور یہ کہ ماں باپ سے جیادہ پیار کرنے والا ہے کیوں ؟ ؟" ــــ رحیم نے پوچھا۔

"ہاں ! ہاں ! ــــ سبحان اللہ اس کی محبت اس کے پیار کا کیا کہنا !" ــــ مولوی آنکھیں بند کر کے جھومتا ہوا بولا۔

"تو تیرا کیا کھیال ہے ماں باپ اپنے بچوں کو بھوکا رکھتے ہیں ہمــ ان کے منہ کی روٹی چھین لیتے ہیں ؟ ــــ انہیں کھا م کھاہ ہی سجا دیتے ہیں !" ــــ رحیم

ذرا زور سے بولا ـــــ اس کی بات میں وزن تھا اس لئے مولوی کھسیا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ تمام مزدور جو غور سے ان دونوں کے مکالمے سن رہے تھے انہیں مولوی سے زیادہ رحیم کی باتیں سچ لگ رہی تھیں۔

"بھائیو! ــ تم میں سے کون کون نماز پڑھتا ہے؟" ـــــ سلٹے کو توڑتے ہوئے یکایک مولوی نے پوچھا ـــ اور سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"بھئی میں کیا پوچھ رہا ہوں؟" ـــــ مولوی نے اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ارے مولبی نماج پڑھنے کا وقت کسے ملتا ہے؟ ـــ سبیرے چھ سے سام چار بجے تلک تو مِل میں کام کرتے ہیں۔ کام چھوڑا تو مالک تن کھاہ کاٹ لے گا ـــــ نماج نہ پڑھنے سے تن کھاہ تو نہیں کٹتی" ـــــ رحیم نے تلخی سے کہا۔

"ابے احمق نماز تو میں بھی پڑھتا ہوں اور پابندی سے ـــــ مگر میری تو آج تک تنخواہ نہیں کٹی!" ـــ مولوی نے تنخواہ نہ کٹنے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کھیر! ـــ تیری طرح کی نماج تو ہم بگیر مصلّے کے بھی پڑھ لیتے ہیں!" ـــــ رحیم مسکراتا ہوا بولا پھر بانکے کی طرف مڑا جو اپنی ـــــ میں چپٹری زلفوں کو میلے سے گلابی رنگ کے کنگھے سے سنوارنے میں مصروف تھا۔

"کیوں بے بانکے؟ ـــ یاد ہے اس روج کی بات؟" ـــــ رحیم اس کے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا ـــــ اور بانکا کھلکھلا کر ہنس پڑا ـــــ سب لوگ حیرت سے دونوں کو دیکھنے لگے۔

"بات بتاؤ! ـ بات بتاؤ!" ـــــ سب نے شور مچا دیا۔

"نہیں ـــ یہ مولبی مارے گا!" ـــ رحیم نے سہمنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا ـــــ اور اس کے اس انداز پر سب ہی ہنس پڑے۔

"چل نہیں ماروں گا!"—— مولوی اس کی اداکاری سے لطف لیتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"بتادوں مولبی؟"—— رحیم نے ایک بار پھر پوچھا۔

"او—بے بخت اب بتا بھی دے کیا مولبی مولبی کر رہا ہے — رحمت خان کے صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا تھا۔

"ٹھیک ہے —— بتلاتے ہیں!"—— یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور مقرر کے سے انداز میں بولنا شروع کر دیا۔

"بھائیو!— کچھ روج پہلے میں اور بانکا دوپہر میں مل کے پچھواڑے بیٹھے جرادم لے رہے تھے —— کہ اتنے میں یہ اپنا مولبی بھی ادھر ہی کو آ گیا اور ایک طرف مصلّہ بچھا کر نماج پڑھنے لگا ..... رحیم ذرا سانس لینے کو رُکا——

"لے یہ کون سی تُو نے نئی بات بتا دی!"—— ایک مزدور منہ بنا کر بولا۔

"ابے سنتا ہے نہیں، بک بک کرے جا رہا ہے!"—— رحیم نے اسے جھڑکا۔

"ہاں تو بھائیو!— یہ اپنا مولبی مصلّہ بچھا کر نماج پڑھنے لگا۔ اِتنے میں کنارے سڑک سے کالج کی چھوکریاں گجریں اور یہ ..... اپنا مولبی ..... آنکھیں ٹیڑھی کر کے انہیں دیکھنے لگا —— اب تم ہی بتاؤ یہ کیسی نماج ہے؟ —— اور یہ سالا مولبی! جو ہر دم کھدا کھدا کیا کرتا ہے —— اپنے یارؔ ہی کو دھوکا دے گیا —— بھئی اپن نماج نئیں پڑھتے مگر کسی کو دھوکا نہیں دیتے!"—— رحیم قصہ سنا کر بیٹھ گیا اور سارے مزدور یہ واقعہ سن کر ہنسنے لگے——

مولوی کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ چیخ کر بولا:

"رحیم!— تیرے سر پر تو شیطان سوار ہے ملعون! جانے تیرا کیا حشر ہو!"

رحیم زور زور سے ہنسنے لگا—— ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا ہو گیا رحیمو بھائی؟" ـــ بانکا اپنا سنگھار کرنا بھول کر گھبرا کر بولا۔
"ابے کیا کھی کھی لگا رکھی ہے!" ـــ رحیم کا بھائی اس کی بے تکی ہنسی پر جھنجھلا کر بولا۔
اور رحیم کی ہنسی قہقہوں میں بدل گئی۔

"ہا! ہا! ہا!" ـــ وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو چکا تھا۔

"بھائیو! ...... اس ...... وقت ...... تت ...... تو ...... ہم ...... ہم ...... ہمارے ...... سروں پر ...... تو ...... یہ مول ...... بی ...... بے ...... ٹھا ہے ...... تو یہ ...... یہ کھد ...... کھد ...... ہی تو ...... سیطان ہوا ...... رحیم نے بڑی مشکل سے ہنسی پر قابو کرتے ہوئے رک رک کر کہا۔
اور تمام مزدور کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ مولوی کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔

"ملعون ـــ جہنمی، لعنتی ـــ خدا غارت کرے!" ـــ وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر جانے لگا ـــ رحیم نے اسے یوں جاتے دیکھا تو لپک کر دبوچ لیا۔

"ابے پیارے مولبی تُو تو میدان ہی چھوڑ کر چل دیا ـــ میرے یار ناراج نہ ہو ـــ میری تو عادت ہے مجاخ کرنے کی ـــ دیکھ میں نے تیرے کُھدا سے کتنا مجاخ کیا مگر وہ تو جرا بھی بُرا نہ مانا ـــ اور تُو اپنے کھپ صورت رحیمو سے رُوٹھ کر جا رہا ہے۔ چل ـــ ما پھ کر دے، آئندہ تجھے کچھ نہیں کہوں گا!" ـــ رحیم معصومیت سے ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ـــ اور مولوی اس کی اس بے ساختہ ادا پر پگھل گیا ـــ پھر وہ بھلا زیادہ دیر رحیم سے ناراض بھی کیسے رہ سکتا تھا۔ ہر آڑے وقت میں وہی تو اس کے کام آتا تھا ـــ پیسوں کی جب بھی تنگی پڑتی وہ واحد شخص تھا جو ادھار دے کر بھول جایا کرتا تھا۔

"اچھا چل ـــ معاف کیا ـــ مگر آئندہ کسی کو کچھ نہ کہنا!" ـــ مولوی اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"دیکھ مولبی —— کسی کا وایعدہ نہیں کیا !" —— رحیم شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"اچھا رحیمو تو جرا کھاموس ہو جا —— ایک بات پوچھنی تھی مولبی سے ۔ جس کے بارے یں آج بل یں صاب بات کر رہا تھا !" —— رحیم کے بھائی کریم نے جھڑکتے ہوئے کہا۔

"ہاں پوچھو !" —— مولوی نے کہا۔

"مولبی یہ اشتراکیت کیا ہوتی ہے ؟" —— کریم نے پوچھا۔

"ابے ہوئے گی کوئی چھمک چھلّو !" —— رحیم شرارت سے ہنس کر بولا۔

"تو چپ بیٹں کرے گا ؟ ؟" —— کریم جھنجلا کر بولا۔

"لے بھائی ہم کھاموس ہو جاتے ہیں !" —— رحیم منہ پر انگلی رکھ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں تو مولبی بتا ناں ؟" —— کریم پھر مولوی کی طرف متوجہ ہوا اور اتنی دیر میں مولوی نے اشتراکیت کا مطلب نکال لیا تھا۔

"یہ جو اش —— ترا .... کیت ہوتی ہے نا ..... یہ جہنم کا عذاب ہوتی ہے ۔ جس گھر میں جاتی ہے .... تباہی مچا دیتی ہے .... اور .... اور ....

"دیکھ لیا نا —— اَبے تباہی بھی تو لونڈیا ہی کے آنے سے آتی ہے !"

رحیم سے نہ رہا گیا اور بول اٹھا۔

"ابے رحیمو کیا ٹیم ہو رہا ہے ؟" —— ایک مزدور نے انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہ پوچھ —— بڑا بُرا ٹیم ہے —— اجان ہو رہی ہے اب یہ سالا مولبی تو سروع ہو جائے گا ٹکریں مارنے —— اپن تو چلے آرام کرنے !" —— یہ کہہ کر رحیم اٹھ کھڑا ہوا —— اور رفتہ رفتہ تمام مزدور اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔

شام کے چار بجے تھے مولوی اپنی کوٹھڑی میں کاہلی سے پڑا تھا یکایک

نعروں کی آواز سن کر چونک اٹھا۔

" یہ کیا ہوا —— آج مزدور نعرے بازی کیوں کر رہے ہیں ؟" وہ سوچتا ہوا کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ تمام مزدور ناچتے گاتے چلے آ رہے تھے۔

" ابے یار مولبی سنا تو نے کچھ —— اپنا رحیمو سکسن ان چارج بنا دیا گیا ہے !" —— ایک مزدور خوشی سے بھرپور لہجہ میں چیخا۔

" سیکشن انچارج ؟ ؟ —— اس کے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلی۔

" ہاں مولبی —— اور پتہ ہے آج صاحب نے سب کے سامنے کہا کہ رحیمو سب سے جیادہ ایمان دار اور محنتی —— ہے ۔ اس وجہ سے اسے سکسن اِن چارج بنایا گیا ہے !" —— مزدور اپنے خوشی سے بھرپور لہجہ میں بولتا رہا اور مولوی خاموش رہا —— وہ تو چار برس سے کام کر رہا تھا مگر انچارج تو کیا اس کی تو آج تک تنخواہ بھی نہیں بڑھی۔

" مبارک ہو بھائیو !" —— اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

" مگر یہ رحیمو ہے کہاں ؟" —— مولوی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوتے بولا۔

" پتہ نہیں کیا بات ہے —— نہ جانے کیوں رحیمو پریشان ہے اِتّی بڑی تو کھُسی ملی ہے !" —— کریم نے پریشانی بھرے لہجہ میں کہا۔

" ہاں کبھی کبھی خوشی کی زیادتی بھی انسان کو غمگین کر دیتی ہے !" —— مولوی نے فلسفہ جھاڑا۔

" لو رحیم بھائی آ گئے !" —— ایک مزدور نے نعرہ مارا۔

" کیوں رحیم بھائی آج تو اس عید کے موکے پر پھلم چلے گی !" —— بانکا لہرا کر بولا ——

" ابے جاؤ تم سب سالو پھلم دیکھنے اپن کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے !" —— رحیم بانکے کو جھڑک کر اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا۔

وہ اپنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں جانے کب سے بے سدھ پڑا تھا .... سامنے کھلی کھڑکی میں گھورے جا رہا تھا ۔ یکایک کسی کے کاندھا ہلانے سے چونک پڑا ۔

" رحیم بائی ــ تم کو کیا ہو گیا ہے .... ام سب تو خوشیاں مناتے ہیں اور تم ایدر پڑا ہے !" ــ رحمت خان نے پیار بھرے لہجہ میں کہا ۔

" ابے یار ــ رحمت کھان یہ کھُدا تو اپنی سمجھ میں بالکل نہیں آیا !" ــ رحیم اٹھ کر بیٹھتے ہوتے بولا ۔

" چھوڑ بائی مولبی کی باتیں ــ چل باہر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں !" ــ رحمت خان نے کہا ۔

" ابے سن تو لے ! ــ رحیم جھنجھلا کر بولا ۔

" آں ــ بول !" ــ رحمت خان آرام سے بیٹھتا ہوا بولا ۔

" یار رحمت کھان ــ میں رات سے بڑا پریسان تھا ــ پتہ نہیں کیا کیا کھیال آ رہے تھے ــ اور ــ اور ــ آج اسی وجہ سے میں کام پر بھی ..... دیر ..... میں گیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری نوکری کھتم .... مگر ..... مگر ......رحمت کھان ...... یہ کیسا کھدا ہے ..... جس نے سجا دینے کے بجائے ترکّی کر دی .... اور ..... اور ... اور .... رحیم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا !!

کراچی ۱۹۷۸ء گرلز ہاسٹل

اعتراف

میں سمندر کے کنارے کھڑی ہوں ۔ تیز ہوا اور لہروں کی پُرشور آواز کے باوجود ایک سناٹے کا احساس ہو رہا ہے ۔ ایسا سناٹا جو صدیوں پر محیط ہو ــــ وہ سناٹا جو ہمیشہ سے میری زندگی کا اہم جزو رہا ہے ۔

برسوں پہلے ــــ ایک نجومی نے بتایا تھا کہ میری موت پانی سے واقع ہوگی ــــ اس بات کا ردِ عمل یہ ہوا کہ مجھے سمندر، تالاب، نہروں اور جھیلوں سے عشق ہو گیا ۔ شاید یہ میری ضدی فطرت تھی کہ جس چیز کو منع کیا جاتا ــــ میرے دل میں اسی شدت سے اس چیز کے حصول کی خواہش پیدا ہو جاتی ۔ میرے گھر سے چند میل کے فاصلے پر ایک خوبصورت جھیل تھی، اکثر میں اپنے چھوٹے بھائی یا بہن کو لے کر وہاں چلی جاتی اور گھنٹوں پانی کے کنارے بیٹھی پانی کی مچلتی زندگی کو اپنی بے قرار زندگی سے ملاتی ــــ پھر یوں ہونے لگا کہ جب بھی میں کسی الجھن میں ہوتی، نہ جانے کیوں پانی مجھے سکون دیتا ــــ شاید نجومی کی کہی ہوئی بات لاشعور میں دفن تھی ــــ یا پھر پانی مجھے ابدیت کا یقین دلاتا ۔

اور آج ــــ آج میں بہت پریشان ، الجھی ہوئی ہوں ــــ نہ جانے کیوں ؟ ــــ میں جوا ڑتالیس برس کی ایک پختہ عورت ہوں ، ایک کامیاب گھریلو زندگی گزار رہی ہوں ــــ میرے شوہر ڈاکٹر ہیں اور میں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوں ــــ

——میرا بیٹا اپنے باپ کی شدید خواہش کے برعکس میڈیکل سے الرجک ہے اور فلسفہ کا طالب علم ہے —— اور بیٹی جسے میں فلسفہ پڑھانا چاہ رہی تھی —— انجینئرنگ کر رہی ہے —— دیکھا آپ نے ہماری زندگیاں کسقدر عجیب ہیں —— ہم سب ایک دوسرے کے آگے بے بس ہیں —— ہم جو چاہتے ہیں وہ حاصل نہیں کر سکتے —— یہ میرا ہی نہیں یقیناً ہر انسان کا المیہ ہے —— میرے شوہر کا خیال ہے کہ میرا بیٹا میری طرح بیک وقت سنجیدہ، شوخ، سمجھدار، ہنس مکھ اور فلسفی ہے —— اس کے قہقہوں میں بھی فلسفہ ہے

—— اس کی شوخی بھی فلسفہ کی عکاسی کرتی ہے —— میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی —— اس وقت رات کے آٹھ بج رہے ہیں —— میں الجھی ہوئی سمندر کے کنارے کھڑی ہوں —— مگر پر شور آوازوں میں بھی مہیب سناٹے چیخ رہے ہیں —— میرے شوہر جو میری خواہش پر یہاں آئے ہیں، میرے بیٹے کے ساتھ ٹہلتے ہوتے دور نکل گئے ہیں —— میں ان کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے تنہائی کے چند لمحے سمندر سے باتیں کرنے کو مجھے عطا کیے —— آج تو مجھے خوش ہونا چاہیئے تھا مگر میں بہت پریشان ہوں —— آج شام ہی میں نے اپنی بیٹی کی منگنی اس کے کلاس فیلو سے کر دی ہے —— اور یہ اقدام میں نے بہت سی مخالفتوں کو اپنے اوپر لے کر سرانجام دیا ہے —— سناٹوں کا شور بڑھ رہا ہے —— بے آواز خاموشیاں چیخ رہی ہیں —— پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو . . . . . لائبریری میں شور ہنگامہ جاری ہے۔ امتحانات قریب ہونے کی وجہ سے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے کے مضامین پر بحث و مباحثہ میں مبتلا ہیں —— میں کتاب کھولے پڑھنے کی کوشش کر رہی ہوں اور اس پر شور لائبریری میں اس سناٹے کو مجسم دیکھ رہی ہوں جس کا شور ان آوازوں پر بھاری ہے۔

"باجی!" —— سعد کی آواز سن کر میں چونک پڑتی ہوں۔

"ہوں —— ہاں! —— آؤ بیٹھو!" —— میں کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے

کہتی ہوں۔

"باجی ___ یہ میرے ایرانی دوست ہیں آذادانی!" ___ سعد نے اپنے ساتھ کھڑے ایک گول منہ کے خوبصورت لڑکے سے تعارف کرایا۔

"خوب! ___ تشریف رکھیے!" میں کہتی ہوں پھر اپنے پرس سے دونوں کو چاکلیٹ نکال کر دیتی ہوں۔

"یہ کیوں؟" ___ آذادانی حیرت سے پوچھتا ہے۔

"سعد کو چاکلیٹ بہت پسند ہے اسی وجہ سے میں ہمیشہ اپنے پرس میں چاکلیٹ رکھتی ہوں!" میں مسکرا کر کہتی ہوں ___ اور وہ رشک بھری نظروں سے سعد کو دیکھتا ہے ___

"تم بہت خوش قسمت ہو کہ کوئی تمہارا اتنا خیال رکھتا ہے!" ___ وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہتا ہے۔

"اور تم بھی اتنے ہی خوش قسمت ہو!" ___ میں لقمہ دیتی۔

"وہ کیسے؟؟" ___ وہ اپنی روشن آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہوا پوچھتا اور پھر زور سے ہنس پڑتا۔

"اوہ! اچھا!" ___ آذادانی انگریزی ادب میں آنرز فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا ___ چند ماہ قبل ایران سے پاکستان آیا تھا ___ پھر وہ اکثر مجھے ملتا۔ کبھی شعبہ میں، کبھی راستہ میں، میں اسے ہمیشہ سعد ہی کی طرح خورد سمجھ کر بزرگوں والا برتاؤ کرتی۔ میری کلاس شروع ہونے میں ابھی خاصا وقت تھا، سوچا ایک پیالی چائے ہی پی لوں ___ اور یہی سوچ کر کینٹین کی طرف مڑ گئی۔

"باجی! ادھر ہی آجایئے!" ___ سعد کی آواز سن کر رک گئی ___ وہ سامنے کینٹین میں اپنے چند کلاس فیلوز اور آذادانی سمیت بیٹھا تھا۔

"میرے خیال میں تو یہ سڑک بھی بری نہیں ہے ـــــ یہیں بیٹھ جایئے!" وہ چڑ کر بولا۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ کینٹین چلو!" ـــــ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"خانم! نہ میں سعد ہوں اور نہ آپ کا خورد ـــــ اس لئے آپ کو میری بات ماننا پڑے گی!ـــــ وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔

"قطعی نہیں! ـــــ بات کرنا ہے تو یہاں کینٹین میں چلو ورنہ میں جا رہی ہوں" ـــــ اس کے لہجے سے مجھے غصہ چڑھ گیا تھا ـــــ حکومت تو مجھے اچھے اچھوں کی برداشت نہیں ـــــ اور یہ لڑکا جو اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھ رہا ہے، مجھ پر رعب گانٹھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ـــــ جیسا آپ کہیئے!" ـــــ اس نے بمشکل اپنے غصہ کو قابو میں کرتے ہوئے لہجے میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"خانم! ـــــ لڑکیوں کو اتنا سخت نہیں ہونا چاہیئے ـــــ کیونکہ ـــــ ہم مرد بہت کمینی خصلت کے ہوتے ہیں ـــــ ہم بڑے سے بڑا طوفان تو سہہ لیتے ہیں ـــــ مگر ـــــ جس عورت کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں ـــــ اس کی معمولی سی بات، ذرا سا تلخ لہجہ ہمیں بکھیر کر رکھ دیتا ہے" ـــــ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"سنو! ـــــ عزیز من ـــــ میں ٹوٹ سکتی ہوں جھک نہیں سکتی!" ـــــ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"چیزوں کا ٹوٹنا تو بہت سہل ہوتا ہے اصل بات تو جب ہے کہ آپ اپنا وجود قائم رکھتے ہوئے دنیا سے اپنے آپ کو منوالیں اور اس کے لئے لچک کی ضرورت ہوتی ہے!" ـــــ وہ گہرے لہجے میں بولا۔

"ایک حد تک تمہاری بات درست ہے لیکن ـــــ پہاڑ اپنی جگہ سے سرک سکتا ہے ـــــ انسان کی فطرت نہیں بدل سکتی!" ـــــ میں نے کہا۔

"یقیناً! ـــــ مگر محبت ایک ایسی چیز ہے ـــــ ایسا جذبہ ہے جو بڑے بڑے

پتھروں کو پگھلا دیتا ہے ـــــ پھر فطرت کیا معنی ؟ ـــــ اور وہ بھی عورت کی فطرت جو ازل سے محبت کی خواہشمند ہے !" ـــــ اس نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

" اچھا ـــــ بیکار کی باتیں چھوڑو ـــــ جو بات کہنا ہے وہ کہو !" ـــــ میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔

" آپ ـــــ چند الفاظ سے گھبرا گئیں تو میری پوری بات کیسے سنیں گی !" ـــــ وہ بولا۔

" جبر کر کے !" ـــــ میں نے حسب عادت ہنس کر کہا۔

"نہیں ـــــ اگر آپ مجبوراً سننے پر آمادہ ہوئی ہیں ـــــ تب ـــ تب ـــ میں اپنے الفاظ کو ضائع نہیں کروں گا !" ـــــ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اور مجھے بہرحال اس کے جذبات کا کچھ تو پاس تھا۔

" نہیں نہیں آزادانی ـــــ میں تو تمہیں پرکھ رہی تھی !" ـــــ میں نے جلدی سے کہا۔

" پرکھنے کا کام فقط جوہری کرتا ہے ـــــ اور آپ تو خود ایک جوہریں !" ـــــ اس نے بڑی رسانیت سے کہا۔

" کیا بکواس کر رہے ہو ؟" ـــــ میں جھینپ گئی۔

" بس آپ کے پاس جب جواب نہیں ہوتا تو اس قسم کی باتیں کرتی ہیں ـــــ اوہ ـــــ میں چائے لے آؤں " ـــــ وہ اٹھ کر چلا گیا ـــــ سمجھ دار لڑکا تھا ـــ شاید چاہ رہا ہو کہ اتنی دیر میں میں معمول پر آجاؤں۔

" آج تو یہاں کی چائے اچھی لگ رہی ہے !" ـــــ اس نے ٹرے میں سے پیالیاں اور کیتلی الگ کرتے ہوئے کہا۔

" تم کو کیسے پتہ چل گیا کہ چائے اچھی ہے ـــــ جبکہ ابھی تم نے پی بھی نہیں ہے !" ـــــ میں نے کہا۔

" اندازہ بھی کوئی چیز ہوتا ہے !" وہ چائے پیالیوں میں انڈیلتا ہوا بولا ۔

" ارے . . . لاؤ میں بناتی ہوں !"۔۔۔ میں نے کیتلی اس کے ہاتھ سے لینا چاہی ۔

" آپ ہر بات شاید بعد از وقت کرنے کی عادی ہیں ۔۔۔ معلوم ہے آدمی اکثر اپنے اسی فعل پر ساری زندگی پچھتاتا ہے "۔۔۔ وہ بولا ۔

" خدایا تم آدمی ہو یا فلسفہ کی کتاب ؟"۔۔۔ میں عاجز آکر بولی ۔

" یہ ساری دنیا فلسفہ پر چل رہی ہے ۔۔۔ فلاسفر سوچتا ہے تب ہی تو اس پر عمل ہوتا ہے ۔ انسان کا ہر فعل ، فلسفہ کی عکاسی کرتا ہے "۔۔۔ وہ پیالی اٹھاتا ہوا بولا ۔

" کیا کہنے ہیں ! ۔۔۔ کچھ عرصہ قبل تو ساری دنیا محبت پہ چل رہی تھی !" میں نے اپنی دانست میں گویا اسے لاجواب کر دیا تھا ۔

" محبت بھی تو فلسفہ ہے ۔۔۔ یہ پہلے فلسفہ کی شکل میں آئی تب اس نے محبت کا روپ دھارا اور پھر ۔۔۔ اس کائنات کی بنیاد پڑی ۔۔۔ اور خانم ! ۔۔۔ میں اپنی کائنات کی بنیاد بھی اسی فلسفہ پہ ۔۔۔ اسی محبت پر رکھنا چاہتا ہوں !"

" ضرور ! ضرور ۔۔۔ خدا مبارک کرے ۔۔۔ کون ہے وہ خوش نصیب ؟"۔۔۔ میں سب کچھ سمجھتے ہوئے انجان بن کر بولی ۔

" میں نے بہت لوگوں کو چیزیں نظر انداز کرتے ہوتے دیکھا ہے مگر آپ جس فنکاری سے ایک حقیقت کو نظر انداز کر رہی ہیں اس طرح کسی کو نہیں دیکھا "۔۔۔ وہ چڑ کر بولا ۔

" اس میں نظر اندازی کہاں سے آگئی !"۔۔۔ میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا ۔

" خانم ۔۔۔ خدا گواہ ہے ۔۔۔ میں نے آج تک اپنی اس ساری عمر

میں محبت نہیں کی ـــــ اور اب مجھے محبت ہوئی بھی تو کیسی لڑکی سے ـــــ جسے میرے جذبات کا ذرا بھی پاس نہیں !" وہ افسردگی سے بولا۔

"سنو! مجھے ایک بات بتاؤ ـــــ کیا محبتیں اتنی جلدی ہو جایا کرتی ہیں ؟" ـــــ میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

"محبت کے لئے وقت، علاقے، جگہ کی کوئی قید نہیں ـــــ آپ کو یاد ہے آپ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ آپ کو آزادی سے نفرت ہے ـــــ تو خانم! یہ دنیا کی واحد چیز ہے جو خود تو آزاد ہے مگر دوسروں کو قید کر دیتی ہے ـــــ آپ کی بات سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو محبت سے نفرت ہے" ـــــ اس نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ـــــ محبت ایک بہت پاکیزہ جذبہ ہے ـــــ میں اس پر ایمان رکھتی ہوں ـــــ مگر ـــــ"

"مگر آپ میری محبت سمجھ نہیں پا رہیں کیوں؟؟" ـــــ اس نے میری بات کاٹ کر جملہ پورا کر دیا ـــــ اور میں حیرانی سے منہ پھاڑے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ہاں یہی سمجھ لو!" ـــــ میں نے اقرار کیا۔

"محبت ـــــ سمجھنے کی چیز نہیں بلکہ محسوس کرنے کا جذبہ ہے۔ میرے خیال میں جس انسان میں ذرا بھی جمالیاتی حس ہوگی وہ بخوبی محبت کے وجود کو محسوس کر سکتا ہے اور......"

یہ میری زندگی کا المیہ رہا ہے کہ میں نے جسے چاہا پسند کیا اس سے اظہار نہیں کر سکی کہ اظہار میری عادت نہیں ـــــ اور جس نے مجھے چاہا، پسند کیا وہ مجھے پا نہ سکا کہ وہ بزدل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آئے دن اسی قسم کی محبتیں دیکھتی رہتی، سنتی رہتی، مگر اس کا کوئی اثر میرے اوپر نہ ہوتا۔

"خانم!" ـــــ اس کی آواز پر چونک کر میں خیالوں کی دنیا سے نکل آئی۔

"ہاں ــــ ہاں کہو میں سن رہی ہوں!" میں نے کہا۔

"نہیں سنیئے نہیں ــــ سمجھنے کی کوشش کیجئے!" اس نے کہا۔

"اچھی بات ہے کہو!" ــــ میں نے بے دھیانی سے کہا۔

"کیا کہوں؟ اب تک جو کہا وہ آپ سمجھیں!؟" ــــ اس نے پوچھا ــــ اور میں گڑبڑا گئی ــــ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے پورے طور سے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"ہاں ــــ سمجھ رہی ہوں!" ــــ میں نے تاثر دینے کی کوشش کی۔ گویا واقعی سب کچھ سمجھ رہی تھی۔

"جو آدمی سمجھ لیتا ہے اس کا ایسا بے تاثر چہرہ نہیں ہوتا!" ــــ اس نے میرے چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"جب میں کسی چیز کی گہرائی ناپنے لگتی ہوں تو ــــ میرا چہرہ ہی کیا پورا وجود بے تاثر ہو جاتا ہے!" ــــ میں نے بات سنبھالی۔

"محبت میں خود اتنی گہرائی ہے کہ مزید کسی گہرائی کی حاجت نہیں رہ جاتی ــــ پھر آپ کن گہرائیوں میں بھٹک رہی تھیں؟" ــــ اس نے مجھے واقعی لاجواب کر دیا تھا ــــ میں نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑا۔

"اس طرح تو آپ پاتال میں پہنچ جائیں گی اور اصل چیز کے وجود سے ناآشنا رہیں گی ــــ یا پھر گہرائیوں کی تلاش میں کسی کھائی میں جا گریں گی!" ــــ وہ بولا ــــ

"اُف! خدایا یہ لڑکا تو واقعی میرے دماغ کی چولیں ہلا دے گا" ــــ میں نے جھنجھلا کر سوچا۔

"اچھا تم کو بات کیا کرنا تھی!" ــــ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اب تو میں جواب چاہ رہا ہوں ــــ بات تو میں نے ساری کہہ دی!" ــــ وہ بڑے اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔

" سنو عزیز دوست ! ــــ یہ ضروری نہیں کہ آپ جو چاہیں وہ آپ کو حاصل بھی ہو جائے ــــ اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ چیز ہمیشہ بے طلب آپ کے پاس آتی ہے ــــ اور ــــ جس کی آپ کو خواہش ہو وہ کبھی نہیں ملتی ! ــــ رہا تمہاری محبت کا سوال تو اس کے لئے واضح کر دوں ، یقیناً میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں ــــ بہت چاہتی ہوں ــــ مگر ــــ خدا گواہ ہے بالکل ایسے...... جیسے ...... جیسے ......

اور اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

" بس خانم ! مجھے زیادہ ذلیل مت کیجئے ــــ میرا یقینِ کامل ہلکی سی امید کی صورت میں تھا ــــ اب وہ ختم ہو گیا ہے ــــ !

اس کے بعد مجھے آذادانی کا کوئی علم نہ رہا ــــ اور چند دن پہلے میری بیٹی کا کلاس فیلو ــــ جب مجھ سے اپنی محبت مانگنے آیا ــــ اور اس نے اپنے باپ کی تصویر دکھائی تو ــــ میں نے ایک فیصلہ کیا ــــ اپنی بیٹی کی زندگی کا فیصلہ ــــ اور آج اس وقت سمندر کے کنارے کھڑی ہوں ــــ سامنے دو ہیولے آہستہ آہستہ میری جانب بڑھتے چلے آرہے ہیں ــــ یہ میرے شوہر اور سعادت مند بیٹا ہے

اے کائنات ــــ جو محبت کی بنیادوں پر استوار ہے ! ــــ

اے زمین ــــ جس نے محبت کے فلسفے سے جنم لیا ــــ

سمندر کی پر شور لہرو ! ــــ جو ہر دم محبت کے راگ الاپتی ہو ــــ

کھلے آسمان پر چمکتے تارو ! ــــ جو محبت کے ماروں کے رازوں کے امین ہو ــــ

ٹھنڈی ہواؤ ! ــــ جو محبت کی جلن کو ٹھنڈک میں بدل دیتی ہو ــــ

ہاں ــــ مجھے اعتراف ہے کہ آذادانی سے مجھے محبت تھی ــــ میں تم سب کی قسم کھاتی ہوں ــــ کہ مجھے اس سے محبت ہے ــــ محبت جو خود آزاد ہے مگر دوسروں کو قید کر دیتی ہے ــــ محبت جو ایک احساس ہے ــــ شعور نہیں !!

کراچی ۱۹۷۹ء

کڑھاؤ

انسانی وجود کا جوار بھاٹا، اس کے اندر کی آگ، کسی لمحہ بھی کم ہونے لگے یا سرد پڑنے لگے تو وہیں سے انسان کی شکست کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر بھی ایک بپھرا ہوا جوار بھاٹا ہے۔ ایسا جوار بھاٹا جس کے کم ہونے کا خوف ہر لمحہ اس پر طاری رہتا ہے۔ اس کے اندر بھی ایک آگ دہک رہی ہے، ایسی آگ جس کے سرد پڑنے کا احساس ہی اس کے دماغ کو مفلوج کر دیتا ہے۔ زمین پر ہجر کے موسم ہیں۔ یہ صدمی آدمی سے آدمی کی دوری کی ہے۔ یہاں صرف بچھڑنے کی رتیں ہیں ــــ وہ جانتی ہے کہ انسان جب دنیا میں اپنی پہلی چیخ بلند کرتا ہے، کرب کی اس تڑپ کو سننے والے مبارک باد کے شور میں دبا دیتے ہیں، لوگ نہیں سمجھ پاتے کہ بے بس انسان کے رونے کی یہ آواز کس دکھ کی علامت ہے! ــــــ کیونکہ سننے والے ہر کراہ کو اپنی خوشیوں کے کانوں سے سنتے ہیں ــــــ اور یہی وقت ہوتا ہے، جب خالق کائنات کی اعلیٰ ترین کاریگری یعنی انسان نہ جانے کتنوں سے بچھڑ کر نہ جانے کتنے لوگوں میں بغیر اپنی مرضی کے لا پھینکا جاتا ہے ــــــ اور پھر اپنی پہلی آواز کی بازگشت میں وہ ساری زندگی گزار دیتا ہے ــــــ اپنے اندر کی آگ کو وہ جلن، نفرت، حسد، قتل و غارت گری لوٹ مار سے تسکین دیتا ہے۔ احمق انسان، بھولا انسان، نادان انسان، بالکل اسی کی طرح ــــــ وہ بھی تو ایک آتش فشاں ہے، ایسا آتش فشاں جو خاموش ہے، اندر لاوا پک رہا ہے،

در باہر پودے کھلے ہیں۔ خوش رنگ پھول لہلہا رہے ہیں۔ سبز و خشک درخت ایستادہ ہیں لوگ دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ " واہ ــ کس قدر پرشکوہ پہاڑ ہے ، کیا رنگ ہیں ــ کیا عجیب حُسن ہے ــ قدرت بھی عجیب عجیب چیزیں پیدا کرتی ہے۔"
واقعی قدرت بڑی عجیب چیزیں تخلیق کرتی ہے ، بناتی ہے ، سنوارتی ہے پھر خود ہی مسمار کردیتی ہے۔ کبھی اپنے ہاتھوں اور کبھی خود اسی کے ہاتھوں۔

وہ اتنا کام کرتی کہ بے طرح تھک جاتی ، مگر یہ تھکن تو صرف جسمانی ہوتی اور جسم کی اسے پرواہ نہیں ، وہ جانتی ہے کہ خاکی جسم کی پرواہ کرکے کیا ملے گا ــ اصل تھکن جو رُوح کی ہے ، ذہن کی ہے ، تخیل کی ہے ، وہ کیسے اُترے گی ــ کون سے شوالے میں ؟ کسی خانقاہ میں ؟ کہاں کی مسجد میں ، کسی مندر میں آسودگی کی دوا ملتی ہے ؟ ؟ ــ
وہ اپنے کمرے میں تنہا رہتی ہے کسی کو ساتھ نہیں سلاتی ، اس لئے نہیں کہ کسی کو تکلیف ہوگی یا وہ بے چین رہے گی بلکہ صرف اسوجہ سے کہ رات کی تیرہ و تار تنہائیوں میں جب اس کی رُوح آہ و زاری کرتی ہے۔ تو اس کی فریاد کسی کے کانوں تک نہ پہنچے مگر باوجود سخت حفاظتی پہروں کے اکثر لوگوں نے یہ کراہ سنی مگر صرف ایک آواز سمجھا ــ ہاں اس کی دادی نے۔
ایک رات وہ ان کے کمرے میں سوئی ، دادی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ بالکل چاق و چوبند تھی ۔ صبح جب وہ سوکر اٹھی تو انہوں نے پوچھا ۔" بیٹی تم سوتے میں کراہتی کیوں ہو ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ؟ ــ اور اس روز اپنے راز کے افشاء ہونے پر وہ چونک گئی ، دماغ جھنجھنا گیا ــ بری طرح چیخ بڑی تھی . . . . بے طرح روئی تھی . . . . اور اس کے بعد اس نے یہ پہرے سخت کردیئے۔

وہ جن دو خانوادوں کی تخلیق ہے ان کے پاس شرافت ہے ، نیکی ہے ، نیک دلی ہے ، خوش اطواریاں ہیں ، اصول ہیں قوانین ہیں ــــ اور اتنی ساری چیزوں کے درمیان پرورش پانے والی ایک ایسی لڑکی جس کے اندر لاوا ایک رہا ہو ــــــ

کرب کی کن کن راہوں سے نہ گزری ہوگی ؟ ——— دکھ کے کون کون سے فاصلے نہ طے کیئے ہوں گے ——— بہ ظاہر اس کی زندگی میں کچھ نہیں لیکن جب جائزہ لیا تو معلوم ہوا زندگی کے جن راستوں سے وہ گزر کر آئی تھی، جہاں سے گزر رہی تھی ——— وہاں تو قدم قدم پر کہانیاں بکھری پڑی تھیں ——— اور لفظوں کی آہنی زنجیروں نے اس کے وجود کو اس بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ ہلنے کی بھی سکت نہ تھی ——— بچپن بہت ساری محبتوں اور لاپرواہیوں کے بیچ گزر گیا ——— لیکن اس بچپن نے ذرا ذرا سی بات پر گھنٹوں سوچنے پہروں خاموش رہنے کا تحفہ دیا ——— پھر عمر کا وہ دور آیا جو شوخیوں اور شرارتوں سے پرُ ہوتا ہے، اٹھنے والا ہر قدم ——— بیتنے والا ہر معصوم لمحہ کیف و سرور کی عجیب انجانی سی لذت سے ہم کنار کرتا ہے ——— یعنی لڑکپن ! ——— ہاں ——— صرف لڑکپن ہی اس کا اپنا تھا ——— اور اسے اس امر کا بھی احساس ہے آج بھی اس کی رگوں میں کبھی کبھی اس کا لڑکپن مچل اٹھتا ہے ——— اور زندہ رہنے کا یہی ایک توانا سہارا اس کے پاس ہے ! ———

ابھی لڑکپن نوجوانی کی سرحدوں سے ہم آغوش ہوا ہی تھا کہ اچانک اسے پتہ چلا کہ وہ تو بالکل بے دست و پا تھی ——— کھڑے کھڑے گر جاتی، چلتے چلتے بے ہوش ہو جاتی، بیٹھے بیٹھے اینٹھ جاتی ——— چھ سات برس یونہی زندگی کی جدوجہد میں گزر گئے ——— جوانی کی رعنائیاں کیا ہوتی ہیں ؟ ——— کچھ پتہ نہ چلا ——— رنگ، خوشبو، بھیگی ہوائیں کس طرح جذبوں میں آگ لگاتی ہیں ——— وہ ان سے نابلد تھی ——— عمر کا وہ حصہ جب لڑکیاں بڑے سبک سپنے دیکھتی ہیں۔ زمین پر اتنی سبک روی سے قدم رکھتی ہیں گویا کانچ کی وادی میں پھر رہی ہوں، امنگوں اور آرزوؤں کی نرم و نشاط انگیز سیج پر کسی کا انتظار کرتی ہیں ——— ان دنوں وہ بورڈنگ ہاؤس میں بند تھی ——— تازہ ہوا کا کوئی بھی تو جھونکا نہ تھا۔ ہر طرف پہرے ہی پہرے ——— جدھر نظر اٹھاؤ عورتیں اور لڑکیاں۔ یہ ان کی اپنی دنیا

تھی ـــــ جہاں ان کے اصول تھے قوانین تھے ـــــ محبتیں تھیں، نفرتیں تھیں، سب ہی کچھ تو تھا ـــــ آپس کے معاشقے تھے، ایک دوسرے کی عجیب سی طلب تھی ـــــ اکثر رات گئے وارڈن کمروں کا گشت کرتیں تو معلوم ہوتا کہ فورتھ ایئر کی سلمیٰ بستر سے غائب ہے ـــــ اور پھر کچھ ہی دیر بعد سلمیٰ فرسٹ ایئر کی کسی کچی پکی عمر کی لڑکی کے لحاف میں گھسی "محبتوں" کے فاصلے طے کرتی نظر آتی ـــــ اور اس کا ذہن الجھ جاتا ـــــ یہ کس قسم کی محبتیں ہیں ؟ کیسی چاہتیں ہیں ؟ اتصال کا کون سا روپ ہے ؟ طلب کی کون سی شکل ہے ـــ پازیٹو + پازیٹو ـــــ نتیجہ صفر سے بدتر ـــــ گھنٹوں وہ وارڈن کا دماغ چاٹتی مگر وہ بھی مجبور تھیں ـــــ ان کا خیال تھا فرسٹریشن اور سپریشن سے نجات کا وقتی ذریعہ یہی تھا ـــــ پھر وہ کس طرح لڑکیوں کو منع کرتیں ؟ کہاں تک پہرے لگاتیں ؟ اور اسے محسوس ہوتا جیسے دنیا کی تمام عورتیں ایک مہلک مرض میں گرفتار ہو چکی ہیں۔ وہ اکثر پریشان ہو جاتی کہ یہ کیسی دنیا ہے ـــــ جہاں کوئی رنگ نہیں ـــــ مگر اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ رنگ تو جذبوں سے نکھرتے ہیں اور جذبے محبت سے نمو پاتے ہیں ـــــ ایسی محبت جس سے وہ قطعی نا آشنا تھی ـــ پھر اس نے چاہا کہ زندگی میں "کچھ" ہونا چاہیئے۔ اور اس "کچھ" نے اسے کالج کی دلچسپیوں رنگا رنگ تقریبات میں گم کر دیا ـــــ مگر کچھ ہی عرصہ بعد معلوم ہوا کہ یہ بھی کچھ نہیں ـــــ زندگی تو کوئی اور ہی چیز ہے ـــــ اور پھر اچانک اس کا ذہن تخریب کی طرف مائل ہو گیا، ہنگامے، اسٹرائیک، تالہ بندی ـــــ اور ایک روز اس مچلتے پھڑکتے بے قرار سیماب صفت دور کی شوریدہ سری پھیکی پھیکی لگنے لگی۔ یہ کیسی زندگی ہے ؟ ـــــ وہ جھنجھلا گئی ـــــ اسی روز پہلی بار خیال آیا کہ زندگی ہے کیا ؟ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کیوں ختم ہو جاتی ہے ؟ سوچوں کا دھارا یکدم ہی قنوطیت کی طرف مڑ گیا ـــــ چھوٹی تھی تو چیزوں کو دیکھتی اور کئی کئی دن سوچتی رہتی ـــــ سمندر کی اٹھتی مچلتی لہروں کی بے قراری، سبز پتوں پر ٹھہرے بارش کے قطرے آسمان پر دمکتے

ستاروں کی محفل، بھیگے موسم کی نم ہوائیں ۔ قوس و قزح کے رنگ ـــــ یہ سب وہ سمجھ نہیں پاتی اور جب کسی بزرگ سے ان کے بارے میں پوچھتی تو جواب ملتا کہ یہ سب اللہ میاں نے بناتے ہیں ـــــ اور اس جواب کے بعد مزید کچھ نہ پوچھتی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جواب کیا ملے گا ۔ ہاں یہ ضرور سوچتی کہ یہ 'اللہ' کون ہے ؟ کیسا ہے ؟ کہاں ہے ؟ کیوں ہے ؟ اس کے پاس اتنے سارے کام کرنے کے لئے کتنے لوگ ہوں گے ؟ ـــــ اکیلا وہ کیسے اتنے سارے کام کرتا ہوگا ؟ ـــــ تب اسے بے طرح اللہ پر رحم آتا ـــــ بے چارے اللہ میاں کسقدر تھک جاتے ہوں گے ـــــ اکثر بدلی چھاتی تو وہ بہت خوش ہوتی ، یقیناً آج اللہ میاں آرام کر رہے ہوں گے ـــــ پھر سوچتی اللہ میاں کی شکل کیسی ہوگی ـــــ تو ذہن میں صرف ایک شبیہ ابھرتی ـــــ اپنے باپ کی ! ـــــ اللہ میاں کے بارے میں سنا تھا وہ بہت پیار کرنے والے ہیں اور غصہ بھی بہت آتا ہے ـــــ وہ جو چاہتے ہیں ہو جاتا ہے !

جب اس نے کالج کو خیر باد کہا تو کسی نے مبارک باد دی ـــــ بی اے پاس کرنے کی اور قید سے چھوٹ جانے کی ـــــ اور وہ کہنے والی کو بس ایک نظر دیکھ کر رہ گئی کیونکہ اسے تو پتہ ہی نہ تھا کہ آزادی چیز کیا ہوتی ہے ؟ ـــــ بند کمرہ ہو ، ہاسٹل کی اونچی اونچی دیواریں ہوں یا کھلی شاداب فضا ـــــ وہ ہر جگہ اپنے آپ کو قید میں محسوس کرتی ـــــ اور یہ احساس آج بھی اس پر غالب ہے ـــــ اس نے قوموں کی آزادی کی تاریخیں پڑھیں ، جدوجہد کی داستانیں سنیں ، لیکن آج تک یہ احساس نہیں ہوا کہ انسان کب اور کیسے آزاد ہے ؟ آزادی کا وہ شعور جس کا سرور کتابوں نے اسے دیا تھا ، حقیقی زندگی میں تو ایک قطرے کے لئے ترستی رہی ہے ، ترستی رہے گی ـــــ ہاں زندگی کا ایک دور ـــــ یعنی اختتام ـــــ کہیں وہی تو اصل آزادی نہیں ؟

اکثر سوچتی کہ اس کے وجود کا مقصد کیا ہے ؟ اس کے خاندان میں کیا کمی

رہ جاتی اگر وہ بیدا نہ ہوتی رشتے، ناطے محبتیں، چاہتیں کیوں ہر جگہ اس کی سوچوں کے آگے فصیلیں کھڑی کر دیتے ہیں۔ مگر ان سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب نہ پاتی ـــــ وہ لوگوں سے سنتی کہ زندگی کا کوئی مقصد ہونا چاہیئے ـــــ مگر جس زندگی ہی کو وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی اس کے مقصد کا تعین کیونکر ہوتا؟ اور یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں اور نہ وہ سمجھا سکتی تھی کیونکہ لوگ مقصد کی باتیں بڑے بڑے حوالوں سے کرتے۔ جہاں حوالے آجائیں وہاں مقصد کیسا؟

ایک دن اس نے اپنے آپ کو ننھے مُنّے بچوں کے درمیان گھرے ہوئے پایا ـــــ پھٹے لباسوں والے بچے، میٹھے لفظوں کو ترسنے والے بچے! ـــــ پیار کی ایک نظر پر قربان ہو جانے والے بچے! ـــــ وہ مگن ہو گئی، ایسا لگا جیسے اس کا سویا ہوا لڑکپن انگڑائی لے کر جاگ اٹھا ہو ـــــ معصومیت، شوخیاں، نکھار، کھلکھلاہٹیں سب کچھ بوند بوند اس کی روح میں اترتا رہا اور وہ زندہ ہوتی چلی گئی۔ قنوطی سوچیں گھبرا کر بھاگ گئیں، جمود تڑخ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ـــــ مقصد کی ایک دھندلی شکل نظروں کے سامنے ابھرنے لگی ـــــ وہ کچھ کرنا چاہ رہی تھی، کچھ دینا چاہ رہی تھی ـــــ مگر کیا کرنا چاہ رہی تھی ـــــ کسے دینا چاہ رہی تھی ـــــ اور تب اس نے سب کچھ وقت کے دھارے کے حوالے کر دیا۔

وہ جان چکی تھی کہ یہ وقت ہی جو کچھ کام اس سے کروا لے گا ـــــ

"یہ ٹکسلا ہے!" ـــــ ایک گونج نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

"یہ ٹکسلا ہے!" ـــــ تاریخ کی آواز اسے اپنے وجود کی بازگشت معلوم ہوئی۔

"یہ ٹکسلا ہے!" ـــــ تکرار نے اسے بے خود کر دیا ـــــ سائیں سائیں کرتے میدان میں وہ تنہا کھڑی تھی۔ گوتم کے قدموں کے نشان اس کی راہنمائی کر رہے تھے۔ تیز دھوپ میں اڑتی ہوئی گرد کو وہ اپنی سانسوں میں اتار رہی تھی۔ کھوئی ہوئی تاریخ کے ادوار اس کے وجود میں توانائی بن کر تازگی کا ایک نیا احساس جگا رہے تھے۔ وہ سو رہی تھی ـــــ مگر ذہن جاگ رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں مگر دل کے تمام کواڑ کھل چکے تھے۔

عطر بیز ہواؤں کے جھونکے دل کو انجانی سی قوت بخش رہے تھے۔ ذہن کے افق پھیلتے جا رہے تھے تب ایک الوہی آواز نے اس کی بند آنکھوں کو آہستہ آہستہ وا کر دیا ــــ اس کا مسکراتا، شوخ لڑکپن بابل کی تنگ ویران گلیوں میں زندگی بکھیر رہا تھا ــــ لمحہ لمحہ گمگ رہا تھا ــــ اس نے آواز دی لڑکپن مٹے ادوار میں گم ہو گیا ــــ وہ زور سے چیخی ــــ اس کی خاموش بے حس نوجوانی کربلا کے ریگزاروں میں لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے اپنی نوجوانی کو بچانا چاہا، سہارے کے لئے آگے بڑھی ــــ مگر ــــ کوفیوں نے قافلوں کی دیواریں کھڑی کر دیں۔ کرب سے اس نے آنکھیں موند لیں۔ صحرا کی آوازیں سنسناہٹیں معدوم ہوتی چلی گئیں۔ یہ کیسی آواز ہے؟ ــــ اس کی آنکھیں ایک دم کھل گئیں ــــ اور وہ لہلہا اٹھی ــــ بولتا ہوا سمندر سامنے ٹھاٹھیں مار رہا تھا ــــ وہ بے خود ہو گئی ــــ سمندر گنگنا رہا تھا ــــ وہ جھوم رہی تھی ــــ سمندر پکار رہا تھا ــــ وہ بڑھ رہی تھی ــــ صدیاں اس کی ہم رکاب تھیں۔ گمشدہ ادوار، کھوئے ہوئے قرن یہ سب اسے اپنے وجود کا حصہ لگ رہے تھے ــــ

"کھوئی ہوئی چیزوں کو تلاش کرنا ہے تو جیتے جاگتے انسانوں سے ناطہ جوڑ ــــ وحشتوں کے امین تجھے تیری منزل تک پہنچا دیں گے"

زمین و آسمان کی سرگوشی پر وہ سوچ میں پڑ گئی ــــ پھر آنکھیں بند کئے سرگوشی کی انگلی تھامے وہ انسانوں کے ہجوم میں آ گئی ــــ اُسے بڑی حیرت ہوئی یہاں سب اس جیسے تھے ــــ ان سب کی سوچیں، عمل کس قدر ہم آہنگ تھے۔ جیتے جاگتے انسانوں کا یہ گروہ دوسرے تمام گروہوں سے کس قدر مختلف تھا۔

"یار ہمارے ہاں کس قدر گھٹن ہے! ــــ ایسا لگتا ہے جیسے ...... جیسے ...... کوئی گلا دبا رہا ہو!" ــــ ایک شام وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ بیٹھی تھی کہ اچانک اس کے ساتھی نے اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوتے بے قراری سے

کہا اور کھسک کر اس کے قریب ہوگیا۔ وہ چند لمحے بغور اسے دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی ——
" اپنے اندر کی آگ میں اس گھٹن کو جلا دو —— پرسکون ہو جاؤ گے !" —— اس نے اپنے ساتھی کو بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، جس کے چہرے پر تناؤ تھا —— آنکھوں میں وحشت تھی، وجود میں بے چینی تھی، حرکات میں تڑپتی مچلتی خواہش تھی۔

" تم ..... تم ..... کیسی لڑکی ہو ؟ تمہارے اندر حرارت کا کوئی وجود نہیں ؟ —— صرف سرد جمود ہے ؟" —— اس کے ساتھی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کاندھوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہولے سے مسکرا دی۔

" اگر ..... اگر ..... میری بات جھوٹ ہے تو اپنے وجود کے دہکتے الاؤ میں مجھے جھونک دو —— جلا کر بھسم کر دو ! ختم کر دو مجھے !" اس کے لہجہ کی لپک پر وہ پھر مسکرا دی۔

" میری پرورش کی بنیادیں جن مضبوط اور پتھریلے اصولوں پر پڑی ہیں —— ان کی وجہ سے یا —— شاید اس وجہ سے کہ میں انصاف، سچ، نیکی اور اخلاقیات پر پختہ یقین رکھتی ہوں —— اور ان کی حفاظت میرا بھی اور تمہارا بھی فرض ہے !" —— اس نے آہستہ سے اپنے ساتھی کے ہاتھوں کو اپنے کاندھے سے اتارتے ہوئے کہا —— اس کے لہجہ کی کاٹ نے اس کے ساتھی کی زبان گنگ کر دی تھی۔

" میں تو سمجھی تھی تمہارے وجود کا تلاطم بہت کچھ بہا لے جائے گا —— مگر تم تو عام سے مرد نکلے —— جس کی خواہشات صرف ایک جسم کے حصول تک ہی رہتی ہیں !" —— اس کی آواز کے کرب نے اس کے ساتھی کی نظریں جھکا دی تھیں۔

زندگی کی شاہراہ پر قدم رکھا تو جہاں نت نئی چیزوں کا مشاہدہ ہوا، وہیں وہ عدم تحفظ کا شکار ہوگئی —— راہ کی رکاوٹیں دور کرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مگر نہ جانے اطمینان کہاں چلا گیا تھا —— گھر کی چار دیواری سے نکلتی تو یوں لگتا جیسے

گھنے اندھیرے جنگل میں بھٹک رہی ہو، ہر طرف درندوں کی چمکیلی آنکھیں اسے گھور رہی ہیں اور وہ سہم کر دوبارہ اپنی پناہ گاہ میں گھس جاتی ــــ پھر ہمت کرتی، پھر نکلتی ــــ ایک نئے عزم کے ساتھ ــــ ایک نئی امنگ کے ساتھ ــــ چند قدم چلتی اور پھر وہی اندھیرا، وہی چمکدار خونخوار آنکھیں ــــ تب وہ فرار کے لئے، اطمینان کے لئے چند لمحوں کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیتی۔

وہ مردوں سے ملتی ان کا رویہ جاگیر دارانہ ہوتا ــــ عورتوں کی محفل میں بیٹھتی تو وہ اسے اپنا ہمدم جانتیں ــــ خوبصورت نکھری نکھری لڑکیاں۔ بدہیئت اور بدصورت مردوں کے ساتھ دیکھتی تو جی چاہتا آسمانوں کو پھاڑ کر عرشِ اعظم پر پہنچ جائے ــــ بدوضع مردوں کی حسین بیویوں کو وہ دکھ سے دیکھتی اور سوچتی کہ یہ عورتیں کیوں خوش ہیں؟ ــــ جب ان عورتوں کے اندر اُترتی تب اسے پتہ چلتا کہ یہ حسین عورتیں اپنے حسن کی سزا بھگت رہی ہیں۔ مجبوری کے اصولوں میں بالجبر، بہ دِقّت سانس لے رہی ہیں ــــ کیونکہ زندگی کا قرض انہیں بہر طور چکانا ہے ــــ وہ انہیں راستہ دکھاتی:

"تم لوگ اذیت کی اس زندگی سے چھٹکارا کیوں نہیں حاصل کر لیتیں؟" ــــ عورتیں حیرت سے اُسے دیکھتیں ان کی خاموش نظریں سوال کرتیں ــــ "پھر ہم کیا کریں گے؟ کیسے زندگی گذاریں گے؟" ــــ کیا مرد اتنی ہی قیمتی چیز ہے جس کے لئے عورت اتنی کربناک زندگی گزارے! ــــ تب اس کے دل میں مردوں کے لئے نفرت ہی نفرت رہ گئی۔ کسی قسم کی خوش گمانی، کوئی اچھی چیز وہ مردوں سے منسوب کر ہی نہ پاتی۔ اس کے جاننے والوں میں کچھ مرد ایسے بھی تھے جن سے صرف محبت کی جا سکتی تھی، مگر ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ اصولی کلیہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بڑے بڑے پارساؤں کے نقاب اس کی ایک نگاہِ غلط انداز سے چاک ہوتے چلے گئے ــــ منافقت اور

جھوٹ سے اٹھے ہوئے خمیر ـــــ بہت سے "با کردار" کھل کر سامنے آ گئے۔ لوگوں سے چند لمحوں کی گفتگو نے نام نہاد غیرت اور اخلاقیات کے بھرم کھول دیئے گھروں میں بیویاں اور ہتھیلیوں پر دلوں کو لئے اس کے ارد گرد پھرنے والے پروانوں نے اس کے اندر کی آگ کو تیز کر دیا ـــــ تب اسے لگا جیسے وہ اپنے وجود کے کڑھاؤ میں زندگی کے تیز شعلوں میں پک رہی ہے ـــــ اُبل رہی ہے ـــــ جانے کب تک اسی طرح پکتی رہے گی۔ جانے کب اس اذیت کا انت ہو گا ـــــ ہو گا بھی یا نہیں؟

اسلام آباد فروری ۸۵ء

برزخ

"ہاؤ از لائف ہنی ؟" ــــ رازی میرے قریب صوفے پر بیٹھتا ہوا بولا۔

" فنٹاسٹک ! ــ تم ادھر کیسے آگئے ؟" ــــ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یو نو ا سین ــــ آئی ایم ویری رچ ــــ ڈپریسڈ !" اس نے لڑکھڑاتے لہجہ میں بوجھل آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، جہاں مے نوشی کی سرخی لمک رہی تھی۔

" اتنی زیادہ مت پیا کرو کہ ڈپریشن کا شکار ہو جاؤ !" ــ میں نے ہال میں بکھرے تیز موسیقی پر وحشیانہ رقص کرتے ملکی غیر ملکی جوڑوں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

" آؤ تم ہمیں جوائن نہیں کرو گی ؟" ــ وہ میرے عین سامنے کھڑا تھا ــــ اس کی بانہیں کھلی تھیں ــ میں نے ایک نظر اس کے وجود پر ڈالی۔

" تم جانتے ہو رازی کہ ......" میں رک گئی وہ میرے سامنے کھڑا ادھورے جملے کی تکمیل کا انتظار کرتا رہا ــ !ــ کہ نہیں !" ــ اور ان دو لفظوں کے ساتھ اس کے کھلے بازو جیسے بے جان ہو کر دائیں بائیں لٹک گئے۔

" ٹھیک ہے ــ ایز یو لائک ــ آئی ول فائنڈ سم باڈی ایلس !" یہ کہہ کر وہ اچھلتے کودتے مردوں اور عورتوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں !" ــ آندرایا کی آواز نے میری محویت کو توڑ دیا۔

"ضرور!" — میں ایک طرف کھسک گئی۔

"لگتا ہے تم کو رقص سے دلچسپی نہیں ہے!" — وہ وہسکی کے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"نہیں یہ بات نہیں — دلچسپی تو ہے مگر اس میں شامل ہونا میرے مسلک کے خلاف ہے!" — میں زور سے ہنس پڑی — وہ چند لمحے غور سے میری طرف دیکھتا رہا — پھر خود بھی ہنس پڑا۔

"مجھے ایسی لڑکیاں پسند ہیں!" — وہ بولا۔

"خوب! — جرمن خون کی رجعت پسندی کم ضرور ہو جاتی ہے مگر جاتی نہیں — بالکل ہم لوگوں کی طرح!" — میں نے کہا اور وہ چونک پڑا۔

"کمال ہے — جینی نے میرے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہے!" اس کے لہجہ میں حیرت تھی۔

"بہت کچھ؟؟ — ارے نہیں جناب سب کچھ!" — میں اپنی رو میں کہہ گئی۔

"یعنی؟؟" — وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اور ایک لمحہ کو میں بُری طرح سٹپٹا گئی۔

"یعنی یہی کہ تم نہ صرف ایک اچھے باس ہو بلکہ بہترین انسان، مخلص دوست اور بہت محنتی ہو!" — میں نے بات کو سنبھالا — اور وہ ہنس پڑا۔

"بالکل اسی قسم کے الفاظ اس نے تمہارے لئے کہے تھے کہ تم اس کی بچپن کی دوست ہو — بے حد مخلص — بہت محبت کرنے والی — بلکہ جس روز تم نے آفس میں اسے فون کر کے یہاں آنے کا بتایا تھا اس روز سے اس نے تمہاری پبلسٹی شروع کر دی تھی — میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہاری اتنی اچھی دوست آ رہی ہے اسے ہمارے ڈنر پر ضرور لانا!" — آندرایا نے بتایا — اور اس سے قبل کہ میں کچھ

جواب دیتی ـــ موسیقی کے پرشور سُر نرم روی سے بہنے لگے۔ کچھ جوڑے تھک کر ہال میں پڑے صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے ـ کچھ اٹھ کر دوبارہ رقص کے لئے چلے گئے تھے۔ زینب تھکی ہاری ہمارے قریب آکر بیٹھ گئی۔

"دیکھو بین ـ یہ آندرایا کسقدر رنگینہ ہے ـــ ایک بار بھی تو مجھے ڈانس کی آفر نہیں دی!" ـــ اس نے سرگوشی میں مجھ سے شکوہ کیا۔

"تو ـ تمہارے لئے کیا فرق پڑا!" میں نے ایک نظر اس کے دبلے پتلے میکسی میں چھپے وجود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ـ کوئی خاص تو نہیں۔"

"آندرایا ـ کیا خیال ہے ایک راؤنڈ نہ لے لیں؟" ـ وہ ایکدم ہی سنجیدہ بیٹھے آندرایا کی طرف مڑی۔ عجیب گہری ہوئی التجا تھی اس کی زبان پر۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں جینی!" ـــ وہ گزرتے ہوئے ویٹر کی ٹرے میں گلاس رکھتا ہوا بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اور زینب بچپن کی سہیلیاں تھیں ـــ ہمارے والدین اتفاقاً ساتھ ہی باہر رہے ہم دونوں نے ایک ہی اسکول میں تعلیم پائی۔ پھر میرے والدین تو ہم بہن بھائیوں کے مستقبل کی خاطر پاکستان آگئے اور زینب کے والدین اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر وہیں رک گئے۔ انہوں نے نوکری کو خیر باد کہہ کر تجارت شروع کردی ـ اور ہم دونوں میں بس خط و کتابت کا ہی سلسلہ رہا ـــ اور اب تقریباً پندرہ سولہ برسوں بعد ہماری ملاقات ہوئی تھی میں ایک سیمینار میں شرکت کے لئے اسلام آباد آئی تھی ـــ اور زینب کے والدین اب مستقل طور پر یہیں تھے۔ آندرایا اس کے ساتھ سفارت خانے میں کام کرتا تھا اس کا باس تھا اور بقول اس کے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار تھے!

" اوہ! سبین کتنا مزہ آیا اَن کی پارٹی میں ـــــ آج میں بہت دنوں بعد گھر سے نکلی تھی!" رات کافی بیت چکی تھی اور ہم دونوں اس وقت پارٹی پر گفتگو کر رہے تھے۔

" مجھے تو حیرت ہوئی پاول کو دیکھ کر ـــ چند برس پہلے جب پاکستان آیا ـــ تو مجھ سے ملنے آیا تھا ـــ کسقدر ہینڈسم ہوا کرتا تھا ـــ اب تو بالکل بھینسا ہو گیا ہے ـــ لگتا ہی نہیں کہ ۲۸، ۲۹ برس کا لڑکا ہے!" میں نے حیرت سے کہا۔

" ہاں ـــ پیتا بے تحاشا ہے اور کھاتا اس سے زیادہ ہے! وہاں کیمبرج میں ہم سب کلاس فیلوز اسے ٹوکا کرتے تھے ـــ مگر مانتا ہی نہیں تھا ـــ!" زینب نے کہا۔

" دنیا کسقدر سمٹ گئی ہے ـــ کہاں کے لوگ کہاں مل جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

" ہاں ـــ اور کبھی فاصلے اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ آمنے سامنے رہتے ہوئے بھی لوگ ایک دوسرے کو مل نہیں پاتے!" ـــ وہ اپنے کپڑے ہینگر میں لٹکاتے ہوئے بولی۔

" ہاں ـــ ایسا بھی ہوتا ہے!" ـــ میں نے لحاف گردن تک کھینچتے ہوئے کہا۔

" ہاں ـــ اب بتاؤ کہ آندرایا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ـــــــ ڈونٹ یو تھنک ـــ میرا مطلب ہے کہ وہ مجھ میں INTERESTED ہے؟" ـــ وہ اپنی مسہری پر آرام سے بیٹھتی ہوئی بولی۔

" وہ زینب ـــ مجھے کوئی خاص اندازہ نہیں ہوا!" ـــ میں نے بات ٹالنا چاہی۔

" پھر بھی ـــ کچھ تو ـــ ڈنر پر ـــ ڈانس پر ـــ کہیں تو؟؟" ـــ اس کے لہجے کی کراہ سے میں تڑپ گئی اور اب سچ بولنا میرے لئے ممکن نہ رہا۔

" ہاں ـــ بہت ہلکا سا ـــ شاید وہ تم میں دلچسپی لیتا ہے ـــ یا شاید ـــ پتہ نہیں ...." میں نے بات گول مول کر دی۔

"یہی تو میں تم کو اتنے دن سے بتا رہی ہوں !"___ وہ خوشی سے چلا اٹھی۔

"لیکن ___ زینب ___ جب تک وہ خود کوئی بات نہ کرے ___ تم پہل نہ کرنا !"___ میں نے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"مگر ___ بین یہ تو ایک حقیقت ہے !" وہ ذہنی طور پر ایک فیصلہ کر چکی تھی اور اسی پر اڑی ہوئی تھی۔

"ہاں ہو بھی سکتا ہے ___ لیکن ایسی حقیقتیں جب عام زندگی کی معمولی سی سچائی سے ٹکراتی ہیں تو چکنا چور ہو جاتی ہیں !"___ میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اونہہ چھوڑو یہ بیکار کا فلسفہ۔ آندرایا کی باتیں کرو !"___ وہ اپنی اخروانی انگلیوں سے اپنے چھدرے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی۔

"اچھا ___ فرض کرو تمہارا افیئر کامیاب ہو جاتا ہے اور تمہاری شادی کسی نہ کسی طرح آندرایا سے ہو جاتی ہے تو کیا تم اُسی سوسائٹی میں ایڈجسٹ کر سکو گی ؟"___ میں نے بغور اس پانچ فٹ کی انتیس سالہ لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا جو اس وقت بارہ تیرہ برس کی احمق سی لڑکی لگ رہی تھی جو کرنا کچھ چاہ رہی ہو اور کرتی کچھ چلی جا رہی ہو۔

"ہاں کیوں نہیں ___ بلکہ ان PATTY پاکستانی مردوں سے بچ جاؤں گی ___ جن کی بورژوا سوچ عورت کے باب میں ایک خاص حد سے آگے جاتی ہی نہیں ___ ان کے نزدیک عورت یا تو دیوی ہے جسے یہ پوج سکیں اور یا پھر داسی ! جو بغیر بولے ان کے ہر اچھے بُرے پر سر جھکا دے ___ تم خود ہی کہو بین ! کیا کوئی تیسرا رتبہ ہماری عورت کی تقدیر میں ہے ؟" اس کے لہجہ میں پوشیدہ بغاوت چلّا اٹھی تھی۔

یہ تمہارا گھڑا ہوا فلسفہ ہے ورنہ اتنی شدت ہے نہیں ___ اور جس کلاس کی تم ہو وہاں تو بالکل ہی نہیں ___ بلکہ وہاں عورت مرد کا استحصال کر رہی ہے !" میں نے کہا۔

"اونہہ ! تم تو بین ! بس اندازے ہی لگاتی رہتی ہو !"۔ وہ چھت کو گھورتے ہوئے بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ رازی نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟" — میرا ذہن ایک دم ہی اس کے بھائی کی طرف چلا گیا تھا۔

"پاگل ہے وہ تو — دیکھو تو مجھ سے آٹھ نو سال بڑا ہے لیکن ابھی تک اپنے آپ کو ٹین ایجر سمجھتا ہے — چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے دوستی کرتا ہے — اور جب وہ اسے انکل کہہ دیتی ہیں تو — تو — سین! پتہ ہے وہ ساری رات کمرہ بند کر کے شراب پیتا ہے یا پھر لاہور چلا جاتا ہے کسی کال گرل کی تلاش میں — مگر۔ اس کے شادی نہ کرنے میں بھی مم اور ڈیڈ کا ہاتھ ہے!" — اس نے تلخی سے کہا۔

"آنٹی . . . . اور انکل کا . . . . . مگر . . . . ."

"خیر چھوڑو بھی — یہ ان کا پرسنل معاملہ ہے — ہاں تو میں تم سے آندرایا کی بات کر رہی تھی" — اس نے میری بات کاٹتے ہوتے کہا۔

"وہ بھی کر لیں گے — لیکن زینب میری سمجھ میں یہ بات قطعی نہیں آرہی کہ نہ تم شادی کرتی ہو نہ رازی — تم لوگوں کے پاس آخر کمی کس چیز کی ہے — دولت، ناموری، STATUS لکھے پڑھے ہو — خوش شکل ہو — اونچی سوسائٹی میں MOVE کرتے ہو — مگر پھر کیوں؟ اور پھر یہ پرابلم تو مڈل کلاس یا لوئر مڈل کلاس کا ہے!" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں — ان کے ہاں صرف شادی پرابلم ہے — ہماری کلاس میں بہت سے اور مسائل بھی ہیں" — وہ کہتے کہتے رک گئی۔

مگر کچھ لڑکیاں میری طرح بھی ہوتی ہیں جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر! وہ پھر بھی خالی ہاتھ ہوتی ہیں۔ اور ان کے پاس صرف اور صرف آرزوئیں ہوتی ہیں — چاہے جانے کی — پانے کی — تمنائیں ہوتی ہیں — گھر بنانے کی۔ گھروں میں حکمرانی کی اور . . . . اور . . . . . اس کی آواز گھٹ سی گئی — اور باہر دسمبر کی شدید سردی کی گلن میرے رگ و پے میں

جیسے اتر گئی۔

"جب میں کیمرج میں تھی ___ ینگ ایج تھی ___ بہت پرو پوزلز تھے ___ آفرز تھیں ___ اس وقت ___ سبین میرے اوپر اتنی پابندیاں تھیں کہ بتا نہیں سکتی ___ بس میری زندگی کا دائرہ گھر سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے گھر تک محدود تھا ___ نہ میں کہیں جا سکتی تھی ___ نہ کسی کو بلا سکتی تھی ___ کیونکہ وہ آزاد سوسائٹی تھی ___ وہاں لڑکیاں جلد خراب ہو جاتی تھیں۔ اگر وہاں تعلیم حدود میں رکھ کر نہ دی جائے ___ تو۔ اس کے نتائج بڑے نکلیں ___ شاید کسی ILLEGAL بچے کی ماں کی صورت میں ___ ___ یہ مما اور ڈیڈ کا کہنا تھا ___ اور پھر سبین، مجھ پر وہ وقت بھی آیا کہ پاکستان ہندوستان سے آنے جانے والے ڈیڈ کے دوستوں کے لڑکوں کو گھر پر انوائیٹ کیا جاتا ___ عجیب عجیب طرح کے فضول لڑکے ___ اور انہیں بڑا WARM WELCOME ملتا ___ پھر مجھے حکم ملتا کہ ان فضول لوگوں کو شہر گھماؤں ___ پکنک پر لے جاؤں ___ یہاں لے جاؤں وہاں لے جاؤں ___ اور ___ میں ___ کٹھ پتلی کی طرح اپنے ماں باپ کے اشارے پر ناچتی رہی ___ کلبوں میں، ہوٹلوں میں ___ ڈانس پارٹیوں میں ___ اور یہ سب میرے ساتھ گھومتے رہے ___ کبھی پلٹ کر نہ آنے کے لئے ___ تم خود فیصلہ کرو سبین، کہ میں کب تک ان بے غیرت بے حس لوگوں کی دل داری کرتی۔

کب تک یہ تماشے برداشت کرتی ___ کب تک ہر نئے آنے والے پر جھوٹی دل داریوں کے جال پھینکتی ___ کیا میرے اندر کوئی حس نہیں تھی؟ ___ کیا میں صرف اور صرف پتھر کی ایک ٹھنڈی مورت تھی؟ ___ جس کے پیاسے لبوں پر یہ لوگ اپنے گرم بوسوں کے جمود چھوڑ جاتے ___ قسم کھا کر کہتی ہوں کہ۔۔۔ کہ ۔۔۔ میں اپنے آپ کو کال گرل سمجھنے لگی تھی ___ بلکہ اس سے بھی کوئی بدتر چیز ..... وہ تو

پھر اچھی ہوتی ہے کہ کچھ پا تو لیتی ہے مگر۔۔۔۔ مم۔۔۔۔ مم۔۔۔۔ میں" اور زینب پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی — خدا جانے کتنے برسوں کی اذیت آج اس کی آنکھوں سے کرب بن کر بہہ رہی تھی — وہ سسک رہی تھی اور میں بے حس خاموش — سوچ سمجھ سے بالکل عاری بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

" یہ لوگ ۔۔۔۔۔ یہ لوگ ۔۔۔۔ مجھے تنہائی کی موت مار دیں گے ۔۔۔۔۔ میں سچ کہتی ہوں سبین میں بہت تھک چکی ہوں — مجھ میں اب چلنے کی سکت نہیں۔۔ ۔۔۔۔ مجھے اب کسی سہارے کی ضرورت ہے — اب مجھے پتہ چل رہا ہے کہ لوگ موت کیوں مانگتے ہیں؟ — کیوں خودکشی کرتے ہیں؟ — اس عذاب سے وہ عذاب یقیناً ہلکا ہوگا — کبھی تو معافی ملے گی —" جب وہ روتے روتے رکی تو پھر بولنے لگی تھی۔ میں اب بھی دم بخود تھی — یوں لگ رہا تھا میرا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

" تمہیں پتہ ہے ہمارا یہ گھر جو سنگِ مرمر کا بنا ہے — جس کی صحیح قیمت کا میں خود بھی اندازہ نہیں کر سکتی — لق و دق سجے سجائے کمرے ۔۔۔۔ درحقیقت یہ گھر نہیں سنسان مقبرہ ہے — جہاں کوئی انسان فاتحہ پڑھنے نہیں آتا — کوئی چراغ جلانے نہیں آتا — اس کے ۔۔۔۔ در و دیوار پر میری راتوں کی ۔۔۔۔ میری بھیانک تنہائیوں کی کربناک چیخیں لپٹی ہوتی ہیں ۔۔۔۔ مگر ۔۔۔۔ مگر ۔۔۔ انہیں ۔۔۔۔ کوئی سننے والا بھی نہیں!" — اس کی درد میں ڈوبی آواز ایکدم رک گئی اور میں جیسے گہری نیند سے چونک اٹھی — کافی دیر تک کمرے میں سناٹا چھایا رہا — ہیٹر جلنے کی ہلکی سی بھر بھر کی آواز جیسے کانوں کو پھاڑے ڈال رہی تھی — بہت سوچنے کے بعد اپنے حواس مجتمع کئے۔

" تمہاری ہر بات اپنی جگہ درست — مگر زینب تم خود سوچو — تم ایک

سمجھ دار لکھی پڑھی لڑکی ہو — یہ بھی نہیں کہ ہمیشہ گھر میں بند رہتی ہو — لوگوں کو بھی پہچانتی ہو — تم چاہتیں تو اپنے حالات سدھار سکتی تھیں — مگر — تم نے تو خود کو الجھا دیا ہے۔ خوامخواہ اپنی ذات سے ہمدردی کیا کرتی ہو — اور انسان کی تباہی کا بھی لمحہ ہوتا ہے جب وہ اپنی ذات پر رحم کھانا شروع کر دے"— میں نے بہت ہمت کر کے نرم لہجے میں سمجھایا۔

"میں نے سبین بہت کوشش کی — مگر مجھے کوئی بھی سپورٹ نہ تھی اور مم ڈیڈ کے خود ساختہ مگر اذیت ناک اصولوں نے، ان کی بے جا حماقتوں نے سب کچھ ختم کر ڈالا — رازی کو ان لوگوں نے جانے کیا کر دیا ہے کہ وہ بھی صرف اپنی ذات سے دلچسپی رکھتا ہے اور بس!"— وہ ٹشو پیپر سے ناک صاف کرتے ہوئے بولی۔ میں اب بھی خاموش تھی۔

"میرا خیال ہے اب تم سو جاؤ — چار بجنے والے ہیں!" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور ایکدم ہی بستر پر دراز ہو گئی — میں نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ بجھا دیا — اور اس گھور اندھیرے میں اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی مقبرے میں ٹھنڈی زمین پر پڑی ہوں اور ہر طرف سفید دیواروں سے لپٹی تنہائی کی مہیب چیخیں میرے اردگرد بھوتوں کی طرح ناچ رہی ہیں — کراہ رہی ہیں — اور اس دہشت میں لپٹے ہوئے نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

سیمینار کا آخری دن تھا — لنچ بریک تک ہم سب اس قدر تھک چکے تھے کہ ایک دوسرے کی شکلوں تک سے بیزاری ہونے لگی تھی۔

"میڈم — آپ کا فون ہے!"— میں ایک طرف خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھی کہ ویٹر نے آ کر اطلاع دی — اور میں پلیٹ رکھ کر فون سننے چلی گئی۔ دوسری طرف زینب تھی۔

"سبین — پلیز تم کچھ دیر کو میرے آفس آ سکتی ہو؟"— اس کی ڈوبتی

ابھرتی آواز سے میں پریشان ہو گئی۔

" خیریت تو ہے ؟" — میں نے پوچھا۔

" بس تم آ جاؤ ! — میرا آفس تو دیکھا ہے نا ! — تمہارے ہوٹل سے تھوڑی ہی دور ہے !" — اس نے اصرار کیا۔

" تم انتظار کرو — میں آتی ہوں !" — گھڑی دیکھتے ہوئے میں نے کہا اور فون بند کر کے تیزی سے پلٹی۔

" ارے کہاں جا رہی ہو اتنی تیزی سے ؟" میرے کولیگ اکرم کی آواز نے میرے قدم روک لئے۔

" اکرم — میں جلدی میں ہوں کیا تھوڑی دیر کو اپنی گاڑی دے سکتے ہو ؟" اسے دیکھ کر اچانک ہی خیال آیا۔

" ہاں ! ہاں ! یہ لو — مگر بات کیا ہے ؟" — اس نے گاڑی کی چابی مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

" ابھی واپسی پر بتاؤں گی !" — میں نے تیزی سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

میں نے گاڑی زینب کے دفتر کے سامنے دھیمے کی — وہ باہر ہی ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی — ہلکے کاسنی رنگ کے فراک نما لباس، اسی رنگ کے پاجامے میں ملبوس ہیل والی جوتی جس پہ پازیب جھانک رہی تھی — گلے میں بڑا موٹا سا بلوچی طرز کا ہار وہ بے چینی سے گھماتے جا رہی تھی — مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ لپکی اور تیزی سے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

" پلیز سبین — مجھے کہیں لے چلو — میں — بہت پریشان ہوں !" اس نے دروازہ زور سے بند کرتے ہوتے کہا۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا — عجیب اجاڑ ہو رہا تھا — آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند چھائی ہوئی تھی — ناک شاید

رونے کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھی ـــــ اور نظروں میں ایک عجیب وحشت ناک سکوت تھا۔

"کیا بات ہے ! ـــــ کوئی سیریس معاملہ ؟" تھوڑی دور جاکر میں نے پوچھا۔

"یو نو ـــــ سین، آج آندرایا نے مجھے منع کر دیا ہے !" ـــــ اس نے میرے ہاتھوں پر اپنا دبلا پتلا انگوٹھیوں اور چوڑیوں سے بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا منع کر دیا ہے ؟" ـــــ میں نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے کچھ حیرت سے پوچھا۔

"پیار کرنے سے !" وہ حیران آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم .... زینب پاگل ہو ـــ بالکل ایب نارمل ـــ کیا ضرورت تھی اُس حرامزادے سے کہنے کی ! ؟" میں غصہ سے کھول گئی۔

"نہیں ـــ تم سمجھیں نہیں ـــــ اصل میں ......" اس کی بے تاثر آواز رک گئی۔

"کیا اصل میں ؟" ـــــ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میں روز صبح اسے KISS کرتی تھی ـــ اور وہ بھی مائنڈ نہیں کرتا تھا ـــــ مگر آج جانے کیا ہوا کہنے لگا مجھے یہ سب پسند نہیں" ـــــ وہ تو بس تکلفاً ہی اپنا گال آگے کر دیا کرتا تھا ـــ مگر میں جانتی ہوں یہ سب کیوں ہوا ہے ـــ جب سے اس کی نئی برٹش اسسٹنٹ آئی ہے تب سے اور...... اور میرا پاؤں پوری قوت سے بریک پر پڑا گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

"زینب ! ـــ جی چاہتا ہے کہ تمہارا گلا دبا دوں !" میں دھاڑی ـــ غصہ میں میرے منہ سے اور کچھ نہ نکلا۔

"دیکھو نا ـــ کسی عورت کے لئے شاید دنیا کی سب سے بڑی ذلت یہی ہے کہ کوئی مرد ـــــ اس کا پسندیدہ مرد ـــــ اسے پیار کرنے سے روک دے !" ـــــ

اس نے میری بات کا کوئی ردِ عمل ظاہر کیئے بغیر بے تاثر لہجہ میں کہا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ محور سے ہٹی اس لڑکی کو کس طرح اس کے مقام پر لاؤں ــــ وہ جانے کیا اناپ شناپ بولتی رہی اور میں گنگ بیٹھی غصہ میں کھولتی رہی یہ بھی اچھا ہی ہوا اس طرح زینب کا غبار نکل گیا تھا۔

"میرے خیال میں اب مجھے آفس چھوڑ دو اور اپنے سیمینار میں جاؤ!" وہ جب بالکل نارمل ہو چکی تو بولی ــــ میں نے ایک نظر اسے دیکھا اور گاڑی چلادی۔

فلائٹ جانے میں خاصی دیر تھی ــــ مَیں رازی اور زینب تینوں ہوائی اڈے کے لاؤنج میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔

"سیمن! کل اخبار میں تمہارے پیپر کے بارے میں کمنٹس پڑھے ــــ اچھا پیپر پریذنٹ کیا تھا تم نے!" ــــ رازی نے کہا۔

"ہاں ــــ مگر تم تو آئے نہیں تھے!" ــــ میں نے شکوہ کیا۔

"آئی ایم ساری سیمن ــــ وہ آفس میں ایک ڈیلی گیشن آیا ہوا تھا اس کی وجہ سے دیر ہوگئی تھی!" ــــ اس کے لہجہ میں شرمندگی تھی۔

"اچھا خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ــــ مگر رازی اب جلد تمہاری شادی کے کارڈ کی منتظر رہوں گی ــــ اور اس کے لئے کوئی معذرت نہیں چلے گی!" میں نے مسکرا کر کہا۔

OH! IT IS IMPOSSIBLE FOR ME NOW

وہ زور سے ہنس کر بولا:

"نہیں ــــ دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی!" ــــ میں بولی۔

"اوہ ڈیم نپولین ایک لفظ چھوڑ گیا اور دنیا اس کے پیچھے لگ گئی ــــ مگر جہاں ممکن ہے وہاں ناممکنات بھی ہیں ــــ دنیا یہ بھول گئی!" ــــ رازی نے منہ بنا کر کہا۔

"تو زینب کی شادی کر دو ــــ تمہارے گھر کا جمود کچھ تو ٹوٹے گا!" ــــ

میں نے مشورہ دیا۔

"جلینی کے لئے تو اتنے پر پوزلز آتے ہیں یہ خود ہی انکار کردیتی ہے ـــــ پوچھ لو تمہارے ساتھ ہی تو بیٹھی ہے!" رازی نے بہن کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں کر دیتی ہوں! ـــــ مگر کیوں؟؟ ـــــ کبھی تم لوگوں نے سوچا ہے! ـــــ تم رازی میرے بڑے بھائی ہو مگر ـــــ مگر ـــــ آج تک میرا کوئی پرابلم ڈسکس کیا ہے؟ ـــــ میری ممی ہیں ـــــ مگر انہیں اپنی مصروفیات اور سوشل ورکس سے ہی فرصت نہیں کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں ـــــ میرے باپ ہیں ـــــ مگر وہ اس چیز سے قطعی بے نیاز ہیں کہ ان کے بے تحاشا بڑے پتھر کے گھر میں ایک جیتی جاگتی زندہ لڑکی بھی سانس لے رہی ہے ـــــ ان کا بس ایک ہی شوق تھا کہ بیٹی کو باہر پڑھائیں ـــــ بیٹی کا کیا شوق ہے؟ اس کی کیا ضروریات ہیں انہیں نہیں معلوم ـــــ وہ اپنی ہی دنیا میں مگن ہیں ـــــ تم سب بے حس خود غرض لوگ ہو ...... اور ......"

"سب پر الزام لگانے سے بہتر ہے کہ تم خود کو دیکھو ـــــ تمہارا کیا رویہ ہے سب کے ساتھ؟ ـــــ تم نے کب ممی ڈیڈی کی بات مانی ہے؟ ـــــ کب میری بات سنی ہے؟ ـــــ رازی نے نرم لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میں زینب کی دماغی کیفیت کو بھانپ چکی تھی اسے لے کر ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ رازی چائے کے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔

"سنو سیین ـــــ میرے آفس میں ایک PEON ہے ـــــ وہ بتا رہا تھا کہ پنڈی سے کچھ دور ایک جگہ ایک بابا جی رہتے ہیں ـــــ بڑی کرامت والے ہیں ـــــ وہ کام کے پیسے تو بہت لیتے ہیں لیکن کام کر دیتے ہیں ایک روز میں PEON کو لے کر وہاں جاؤں گی" ـــــ اچانک ہی اس نے کہا اور میں حیران رہ گئی۔

"پاگل ہو گئی ہو؟ ـــــ یہ سب کیا کر رہی ہو؟ ـــــ خدا کے لئے کچھ ہوش کرو!" ـــــ

میری آنکھیں واقعی بھیگ گئی تھیں۔

"مم ..... میں ..... کیا کروں؟ ــــ آفس میں سب ہی کو اس بات کا پتہ ہے ــ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ضرور بابا جی کے پاس جاؤں گی اور اپنے محبوب کو ان سے مانگ لوں گی!" اس کے لہجے میں عجیب دردآمیز خالی پن تھا۔

"خدا کے لئے زینب ایسی بہکی بہکی باتیں مت کرو ــــ یہ بابے قسم کے لوگ کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتے ــ خدا سے مانگو ــ اپنے آپ کو سنبھالو ــ عقل سے کام لو ــــ کیا ہو گیا ہے تم کو؟؟" ــــ میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ــ مگر وہ کچھ نہیں بولی بس ایک جامد مسکراہٹ اس کے خشک پیاسے ہونٹوں پر کپکپاتی رہی۔

"تم کو پتہ ہے رازی کیوں نہیں شادی کرتا؟ اسے بھی میرے ماں باپ نے ان حالوں کو پہنچایا ہے ــــ وہ جو بھی لڑکی پسند کرتا مم فوراً اس میں عیب نکال دیتیں ڈیڈ اس کے باپ کا STATUS دیکھنے لگتے ــــ اور اب مم رازی کو ہر وقت طعنے دیا کرتی ہیں کہ تم سے کون شادی کرے گا ــــ بال تمہارے اڑنے لگے ہیں ــــ فریکلز تمہارے آگئے ہیں ــــ کبھی کچھ اعتراض کبھی کوئی بات ــــ مم ہم دونوں کو الزام دیتی ہیں کہ ہم شادی نہیں کرتے ــــ میں سچ کہتی ہوں سبین میں تم کو وہ الفاظ بتا نہیں سکتی جو وہ ہر دوسرے تیسرے دن مجھ سے کہتی ہیں یہ بات ہماری آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ہم سے کس بات کا بدلہ لے رہی ہیں ــــ کیسی ماں ہیں جنہیں اولاد کے دکھ کا احساس تک نہیں ہے ــــ ہم نے تو کبھی ان کی حکم عدولی نہیں کی ــــ ان لوگوں نے جیسا چاہا ہم نے کیا ــــ کیا فرماں برداری کا یہی انعام ہوتا ہے؟ ــــ ہم دونوں نے ہمیشہ اپنا دل مار کر ــــ اپنی خواہشات کو کچل کر مم اور ڈیڈ کی بات مانی مگر۔۔ ..... مگر ..... اور وہ مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں آنکھیں موندے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی ــــ

جہاز کی اڑان بہت ہموار تھی اور میرا ذہن بے حد ناہموار ـــــ پچھلے سات دنوں کا ایک ایک لمحہ میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا ـــــ رو رہا تھا ـــــ فریاد کر رہا تھا ـــــ اور میں بے بس تھی سب کچھ جانتے ہوئے بھی ـــــ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی ـــــ زمین سے اُکھڑا ہوا پودا نہ صرف مرجھا رہا تھا بلکہ اس کی رگ رگ شکست و ریخت کا شکار ہو چکی تھی ـــــ اس پودے کو اب نہ زمین قبول کر رہی تھی اور نہ اس کی شفیق آب و ہوا ـــــ اس میں زندگی کی کوئی رمق پیدا کر پا رہی تھی ـــــ میں کچھ کرنا چاہ رہی تھی مگر ـــــ باوجود کوشش کے نہیں کر سکتی تھی ـــــ یہ میں جانتی تھی ـــــ !!!

اسلام آباد ۸۵ء

شکست

ہم سب کی نظروں میں اس کے لئے مختلف تاثرات تھے۔ حسد، حیرت، خوشی ـــــ
اور وہ بڑے اطمینان سے پوری کتھا سنانے کے بعد شاید ہم سب کے ریمارکس کا انتظار کر رہی
تھی ـــــ شہر یار نے تو باقاعدہ اپنی بے سری آواز میں بابل گانا شروع کر دیا تھا ـــــ

"میرے خیال میں تو دوسری شادی کرنا کوئی برائی نہیں جبکہ شادیوں کا اتنا
مسئلہ بھی ہے !" ـــــ سماجیات کی طالبہ نوری رومال سے اپنے گال تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

"ہاں ـــــ کوئی برائی نہیں ـــــ ایک عدد بیوی، چار جوان ہوتے بچے ـــــ
اور اس پر یہ چونچلے !" ـــــ روشی کھلکھلائی۔

"اُلو کی پٹھی !" ـــــ اب بس بھی کر ـــــ آخر کو اتنا عاشک لوگ تمہارا ہے ـــــ
بندھ جا کسی کے ساتھ !" ـــــ زرینہ بلوچ نے سوچ سمجھ کر بڑے پیار سے اسے راہ دکھائی۔

"ہاں اور کیا ! ـــــ زرینہ ٹھیک کہہ رہی ہے بھئی اگر ایک آدمی دو بیویاں افورڈ
کر سکتا ہے تو کیا برائی !" ـــــ شہوار بولی۔

"مگر یار ـــــ اس طرح یعنی یہ بٹا ہوا مرد کس طرح یہ افورڈ کر سکے گی !" ـ جہاں آرا،
جو بڑی دیر سے خاموش تھی بول اٹھی۔

"تم کیا کہتی ہو ؟" ـــــ وہ میری طرف پلٹی۔

"میں وہی کہوں گی ـــــ جو تم سوچ رہی ہو !" میں نے مسکرا کر کہا اور وہ

خاموش ہوگئی۔

"مگر یار ـــــ یہ سر رفیق کو کیا سوجھی ؟ ؟" ـــ آنرز کی عصمت نے حیرت سے کہا۔

"وہی ـــ جو ہر مرد کو ایک چٹک مٹک فارغ لڑکی کو دیکھ کر سوجھتی ہے !" ـــ روشی زور سے ہنسی۔

"تمہاری یہی تو کمینگی ہے، کیا ضرورت ہے ہر ایک سے مسکرا مسکرا کر بات کرنے کی آخر" سر" لوگ فرشتے تو نہیں ہوتے !" ـــ عصمت غرائی۔

"ارے واہ ! ـــ تو کیا اب میں ہر ایک سے منہ ٹیڑھا کر کے ملوں ؟ یہ کیا بات ہوئی کہ آدمی اپنے اخلاق کا مظاہرہ بھی نہ کر سکے !" ـــ روشی منہ بنا کر بولی۔

"اچھا چھوڑو ! ـــ تمہارے تو یہ یکطرفہ معاشقے چلتے ہی رہیں گے ـــ میری تو کلاس کا وقت ہوگیا ہے !" ـــ میں کہتی ہوئی کھڑی ہوگئی اور سب لڑکیاں اپنے اپنے شعبوں کی طرف چل دیں۔

میں اور روشی کلاس فیلوز تھے ـــ فرسٹ ایئر سے ایم اے تک ـــ یونیورسٹی سے نکلی تو میری بارات تیار کھڑی تھی ـــ روشی کے والد کا تبادلہ کسی اور شہر ہو گیا۔ خط فون، کبھی کبھی کبھار کی ملاقات اور بس ـــ یوں سات طویل برس ایکدم سے گزر گئے۔

اس روز شام میں، مَیں اپنے دونوں بچوں کو لئے پڑھا رہی تھی کہ ایک شور ہنگامے سے چونک اٹھی۔ تیز تیز آواز گھر کے اندر داخل ہو چکی تھی ـــ یہ روشی تھی !

"ارے ! ـــ تم تو باقاعدہ اماں بن گئی ہو ! ـــ وہ مجھ سے لپٹ گئی ـــ وہی عادتیں، وہی اطوار ـــ سات برسوں نے ظالم پر ذرا بھی تو اثر نہیں ڈالا تھا اور میں واقعی اماں بن گئی تھی۔

"اور تیرا یار کہاں ہے ؟" ـــ وہ ایک آنکھ دبا کر مسکرائی۔

"بے ہودگی مت کرو، بچے پریشان ہو رہے ہیں ——" میں نے سرگوشی میں آنکھیں پھاڑے، بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

" ارے میری جانوں ! —— یہ تمہاری اماں جو ہیں ناں —— پکی حرافہ ہیں — بڑے معرکے کا عشق چلایا تھا اور جب ...... "روشی !" میں چیخ پڑی —— وہ دونوں بچوں کو بانہوں میں بھرے جو کہانی سنا رہی تھی —— میری چیخ سے نامکمل رہ گئی اور وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"پکی منافق ہو یار — اماں باوا سے تو ڈری نہیں، بچوں سے مات کھا گئیں !" —— روشی صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔

" ارے ! — روشی زندہ باد ! —— کہاں سے اتنے برسوں بعد ٹپک پڑیں ؟؟" سلیم لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

" اوہ ! —— آگیا تیرا یار !" — اس نے آہستہ سے کہا اور سلیم کی طرف لپکی۔

سلیم نے انتہائی بزرگانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرا —— وہ ہنس پڑی

تم کیسے ہو والد محترم ! —— اس نے پوچھا :

" بس دیکھو بیٹی کی پیدائش کے بعد تمام لڑکیاں بیٹیاں لگنے لگی ہیں !" —— سلیم ایک طرف بیٹھتے ہوئے بولے۔

"یہ خطرناک بات ہے —— ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے جو جوانی کو بزرگی میں ڈھال لیا !" —— روشی مسکراتے ہوئے بولی۔

" مجھے خود حیرت ہوتی ہے —— یہ بیٹیاں واقعی بڑی ظالم چیز ہوتی ہیں !" وہ پیار بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

" ارے —— یہ جو اتنی ممتا بھری نظروں سے دیکھ رہے ہو، کیا اسے بھی بیٹی سمجھنے لگے ہو !" —— روشی نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اور ہم دونوں بھی ہنس پڑے۔

"بھئی اسی کی وجہ سے تو آج یہ مقدس جذبہ میرے اندر پیدا ہوا ہے!" —— سلیم مسکراتے ہوئے بولے۔

رات کھانے کے بعد ہم تینوں گھر کے مختصر سے باغیچہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے گفتگو کا موضوع روشی ہی تھی۔

"روشی —— میرے خیال میں اب تم شادی کر ڈالو!" —— سلیم بولا۔

"ہاں سلیم —— اسی لئے یہاں آئی ہوں!" —— اس کا جواب سن کر ہم دونوں خوشی سے چیخ پڑے۔

"دوبارہ زندہ باد!" —— سلیم نے نعرہ مارا۔

"تم آئی ہو تو لگتا ہے زندگی آٹھ نو برس پہلے کیمپس میں چلی گئی ہے!" —— سلیم ہنسے۔

"اچھا بھئی اب میرا خیال ہے چلوں!" —— روشی گھڑی دیکھتے ہوئے بولی۔

"ارے الو کی پٹھی —— نہ اتہ بتایا اپنے عاشق کا نہ پتہ آخر تم کو اتنا جلدی کیوں ہے؟" —— میں نے زربینہ بلوچ کی نقل اتاری۔

"ارے ہاں —— وہ آجکل ہے کہاں؟ —— سنا تھا کہ کسی چوہدری کے بیٹے سے شادی ہو گئی!" —— روشی نے پوچھا۔

"ہاں —— کافی ہنگاموں کے بعد شادی ہوئی —— اس کے سارے خاندان والے توپ بندوقیں لے کر نکل آئے تھے —— مگر بڑی دلیر لڑکی ہے —— اس نے STAND لیا —— اور آخر کار بڑی دھوم دھام سے یہ شادی ہوئی —— آجکل لاہور میں ہے اکثر فون وغیرہ آتے رہتے ہیں —— کبھی کبھار میاں کے ساتھ خود بھی آجاتی ہے!" میں نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"ہوں —— اور وہ ....." اچھا بکواس بند —— پہلے یہ بتاؤ کہاں شادی

کر رہی ہو ـــــ کس سے کر رہی ہو ؟" ـــــ میں نے بے تابی سے پوچھا۔
" ویسے یار ہو گا خوش قسمت جس کے پلّے بندھو گی !ـــــ سلیم بولا۔
" پتہ نہیں یار ! ـــــ وہ خوش نصیب ہو گا یا میں !" ـــــ روشی ایکدم سنجیدہ ہو گئی۔
میں نے جلدی جلدی اس کے تمام عشاق کے نام گنوا ڈالے ـــــ وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی۔

" ان میں کوئی نہیں !" ـــــ اس نے کہا۔

" پھر ؟ ؟" ـــــ میں اس کا منہ دیکھنے لگی۔

" بات یہ ہے فرزانہ یہ جتنے لوگوں کے تم نے نام گنوائے نا ـــــ یہ سب ـــــ بس یونہی تفریح چاہتے تھے ـــــ وقت گزاری ایک اور عورت سے تعلق ـــــ اور بس ! ـــــ جب یہ نہ ہو سکا تو ـــــ تمہیں معلوم ہی ہے کہ ایک ایک کرکے سب الگ ہو گئے ـــــ ! وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
" مگر روشی میرے ساتھ کے کتنے لڑکے تمہارے خواہش مند تھے !" ـــــ سلیم کے لہجہ میں کچھ حیرت تھی۔

" ہاں تھے ـــــ مگر صرف کہنے کی حد تک !ـــــ وہ بولی۔
" تو پھر تم وہی کر رہی ہو جس کی شدید مخالفت کرتی تھیں ـــــ یعنی اماں باوا کی پسند سے ؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

" پسند تو صرف میری ہے ـــــ اماں باوا نے تو بہت روکنے کی کوشش کی !ـــــ اور اس کی بات پر ہم دونوں چونک اٹھے۔

" کون ہے ؟ ؟" ـــــ سلیم نے پوچھا۔
" سلطان کو جانتے ہو ؟ ؟" ـــــ اس نے پوچھا۔
" سلطان ـــــ سلیم کچھ لمحے سوچتا رہا۔

" کہیں وہ تو نہیں جو فزکس میں پڑھتا تھا ـــــ اکثر لائبریری میں ملتا تھا ـــــ اور جو ایک حادثے میں معذور ہو گیا تھا !" ـــــ سلیم کی آواز میں بے یقینی تھی۔

" ہاں وہی !" ـــــ وہ بولی

" مگر روشی ـــــ اس سے تو کوئی ایسا خاص تعلق بھی نہ تھا !" ـــــ سلیم رک گئے۔

" ہاں تعلق تو نہیں تھا ـــــ مگر پھر بھی ہمارا دوست رہا ہے ـــــ پھر برائی کیا ہے اس میں ؟ ؟" ـــــ روشی نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

" بات برائی یا اچھائی کی نہیں ہے ـــــ تم خود سوچو کہ وہ پیروں سے معذور ہے اور !" ـــــ سلیم رک گئے۔

" اور سروس بھی معمولی ہے کیوں ؟ ؟" ـــــ روشی نے جملہ مکمل کر دیا۔

" ہاں ! ـــــ روشی ذرا پریکٹیکل ہو کر سوچو ! ـــــ سلیم نے سمجھانا چاہا۔

" یہ کوئی جذباتی سوچ نہیں ہے بلکہ میں نے کافی عرصہ سوچنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے !" ـــــ اور یہ شادی میری مرضی سے ہو رہی ہے۔ سلطان بے چارے کو تو ابھی تک یقین نہیں آتا ! ـــــ یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

میں اور سلیم کافی رات تک روشی کے کردار کے اس انوکھے پہلو پر حیرت کرتے رہے، اسے داد دیتے رہے۔ ایسی لڑکی جو عیش و عشرت میں پلی ہو جس نے زندگی میں کسی مسئلہ کا سامنا نہیں کیا۔ اچانک کس طرح اتنا بڑا فیصلہ کر لیا !

شادی کے بعد وہ مستقلاً کراچی آ گئی۔ اکثر ہمارا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا رہتا۔ سلطان اپنے گھر کا کفیل بھی تھا اور سب سے بڑا بیٹا بھی ـــــ اس کی ماں تو بات بعد میں کرتیں روشی کو پہلے دعائیں دیتیں۔

" یار سلطان ایسا پیارا آدمی ہے کہ بتا نہیں سکتی ـــــ باوجود معذوری کے اس میں کسی قسم کا کمپلیکس، کوئی کمتری کا احساس نہیں ہے ـــــ جس طرح میں پہلی عورت

اس کی زندگی میں آئی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ وہ پہلا مرد ہے جو میری زندگی میں اتنے بھرپور طریقے سے آیا ہے! ـــــ روشی اکثر سلطان کے بارے میں اس قسم کی محبت آمیز باتیں کرتی۔ شروع شروع میں ہم سب کو یہ جوڑا بڑا عجیب لگتا تھا مگر اب یوں محسوس ہوتا گویا دونوں ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہیں، سلطان نے نوکری چھوڑ کر ایک رسالہ نکال لیا تھا اور دونوں میاں بیوی دن رات اسی میں لگے رہتے۔

"روشی!" ـــــ ایک رات کتاب پڑھتے پڑھتے اچانک سلطان نے پکارا۔

"کہو جانِ روشی!" ـــــ وہ اس کی طرف کروٹ لیتے ہوتے بولی۔

"ایک بات سوچ رہا ہوں!" ـــــ وہ روشی کے چہرے کو دیکھتے ہوتے بولا، جہاں تھکن کے آثار تھے۔

"ہوں ـــــ بولو!" ـــــ وہ مسکرائی۔

" سوچتا ہوں کہ کیسا شوہر ہوں جو تمہیں ایک لمحہ کو وہ سکھ، وہ آرام نہیں دے سکا جو بیویوں کا حق ہوتا ہے!" ـــــ وہ خاموش ہو گیا۔

" سلطان ایسی باتیں نہ کرو ـــــ ہمارے درمیان اس گفتگو کے علاوہ ہر قسم کی بات جائز ہے!" ـــــ روشی سلطان کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ وہ خاموشی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔

"روشی!" ـــــ کافی دیر بعد اس نے پھر پکارا۔

"ہوں، اب کیا ہوا؟" ـــــ اس کی غنودہ آواز ابھری۔

" پچھلے چار پانچ برسوں سے ہم اس رسالے کے لئے کام کر رہے ہیں ـــــ خدا کا شکر ہے کہ پیسہ بھی کافی جمع ہو چکا ہے۔ اب میں باہر علاج کے لئے جا سکتا ہوں!" ـــــ سلطان کی آواز ابھری ـــــ اور روشی کو جیسے کسی نے بجلی کا جھٹکا دے دیا ـــــ ہیں؟؟ ہاں ـــــ ہاں سلطان ـــــ ارے یہ تو مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا ـــــ کمال ہے ـــــ

یعنی یہ بات تو میں بھول ہی چکی تھی ـــــ" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی ۔ سلطان نہ اس کے لہجے کو پا سکا اور نہ ہی اس کی اضطراری کیفیت کو جان سکا ۔

"بس ٹھیک ہے ۔ کل ہی سے انتظام شروع !" ـــــ یہ کہہ کر اس نے لیمپ بجھا دیا اور اندھیرے میں گم ہو گئی ـــــ دو تین بار سلطان نے اسے آواز دی مگر اسے سوتا دیکھ کر خود بھی سو گیا۔

"یہ بہت اچھی خبر ہے ـــــ کب جا رہے ہو تم لوگ ؟" ـــــ ایک روز میں اور سلیم ان کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ سلطان علاج کے لئے کہیں باہر جا رہا ہے ۔

"یہ تو روشی بیگم ہی جانتی ہیں ـــــ !" سلطان نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا جو چائے بنانے میں مشغول تھی

"بھئی "ہم لوگ" نہیں صرف سلطان" ـــــ اگر دونوں چلے گئے تو رسالے کا بیڑہ غرق ـــــ روشی میری طرف چائے بڑھاتی ہوئی کھلکھلائی ۔

"بھائی جان نے ہسپتال میں ان کا بندوبست کر دیا ہے ، بس ایک آدھ مہینہ میں یہ روانہ ہو جائیں گے !" ـــــ وہ بولی ۔

"اور پھر ـــــ میں روشی کے قدم سے قدم ملا کر چلوں گا !" ـــــ سلطان کے لہجہ میں خوشی ہی خوشی تھی ۔

"کب تک جا رہے ہیں سلطان ؟" ـــــ کوئی تین ہفتے بعد میں نے روشی کو فون کر کے پوچھا ۔

"پتہ نہیں ـــــ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے ! ـــــ شاید اگلے ماہ کے آخر تک کچھ ہو !" ـــــ روشی نے بتایا۔

"کیسی گڑبڑ ؟" ـــــ میں نے پوچھا ۔

این او سی کا چکر ہے ، گورنمنٹ اجازت نہیں دے رہی ہے !" ـــــ اس نے کہا۔

"کمال ہے ـــــ ایسی بھی کیا مصیبت ، کون سا سرکاری پرچہ ہے پھر علاج کے لئے ۔۔۔۔۔۔"

"پرچہ سیاسی ہے ـــــ اور تم تو جانتی ہو کچھ بھی مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے !" ـــــ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ۔

"سلیم سے کہوں !" ـــــ میں نے پوچھا ۔

"ارے نہیں ـــــ ڈیڈی اسلام آباد میں ہیں وہ کچھ کروا دیں گے !" ـــــ اس کے لہجہ میں اطمینان تھا ۔

"اچھی بات ہے ، ایک دو روز میں ہم لوگ آئیں گے تمہاری طرف !" ـــــ میں نے کہا اور فون بند کر دیا ۔

این او سی کی تگ و دو میں کئی ماہ گزر گئے ۔ سلطان نے ، سلیم نے ہر ایک نے کوشش کر کے دیکھ لیا ، مگر ڈاکٹروں کے بورڈ نے فیصلہ دے دیا تھا کہ علاج ملک میں بھی ہو سکتا ہے ـــــ ! اور یہی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی ۔

ہم چاروں خاموش بیٹھے تھے ـــــ روشی ہمیشہ کی طرح مطمئن و مسرور ، البتہ سلطان کچھ پریشان تھا ۔

"میرے خیال میں روشی ان دونوں کو باتیں کرنے دو ، ہم تم باہر چلتے ہیں !" ـــــ میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور ہم دونوں باغیچہ میں نکل آئے ۔

"بے چارہ سلطان کسقدر مایوس تھا !" ـــــ میں نے اس کے ساتھ ٹہلتے ہوئے کہا ۔

"ہاں وہ یقین کر چکا تھا ، اس وجہ سے پریشانی ہوئی اور کوئی بات نہیں !" ـــــ روشی بولی ۔

"بے یقینی کی کوئی وجہ بھی نہ تھی !" ـــــ میں نے کہا ۔

"ارے یار ہماری سرکار جو نہ کرے کم ہے ! روشی زور سے ہنس دی اور

میں ایک نظر اسے دیکھ کر خاموش رہ گئی۔

"روشی ۔۔۔۔ تم نے یہ سب کیوں کیا ؟ ؟" ۔۔۔ میں نے اچانک رک کر اس سے کہا ۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا ۔

"کیا کیا ؟ ؟" ۔۔۔ اس نے بظاہر اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا ۔

"یہی این او سی کا چکر !" ۔۔۔ میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا ۔

"میں نے کب کچھ کیا ہے ، گورنمنٹ نہیں دے رہی ہے !" ۔ وہ بے حسی سے بولی ۔

"بکواس کرتی ہو تم ! ۔۔۔ یہ سب کھیل تمہارا بنایا ہوا ہے ۔۔۔ میں جانتی ہوں تم کہاں تک جا سکتی ہو ۔۔۔ کیا ۔۔۔ کیا تم ۔۔۔ نہیں چاہتیں کہ ...... سلطان ۔۔۔ جو تم کو ۔۔۔ اپنی زندگی سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہے ۔۔۔ وہ تمہارے مقابل کھڑا ہو سکے !" ۔۔۔ شدتِ جذبات سے میری آواز بھرا گئی تھی ۔ میں نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا جس پر ضبط کی سرخی چھائی ہوئی تھی ۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے کتنا چاہتا ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ اس چاہت ..... کو ..... بچانے کے لئے .... اگر وہ پیروں .... پر .... کھڑ .... کھڑا ہو گیا .... تت .... تت .... تو .... اور ... یہ ... دوری .... یہ شکست .... میری برداشت .... سس .... سے ....اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔"

میری نظروں کے سامنے وہ تمام چہرے گھومنے لگے جو روشی کے دیوانے تھے ۔ سر رفیق ، یاسین علی ۔۔۔ اکبر ۔۔۔ اور نہ جانے کون کون ۔۔۔ جن کی بیویاں ، بچے ان کے انتظار میں رہتے اور وہ ۔۔۔ ! ۔۔۔ اس کے آگے میرے ذہن نے سوچنے سے انکار کر دیا ! !

زنجیریں

"مونا ـــــ تیار ہوگئی ہو؟" ـــــ میں اس آواز پر چونک پڑی۔

"ہاں ـــــ آرہی ہوں۔ تم چلو" ـــــ میں نے دروازے پر کھڑے مینجر سے کہا اور کھلی کھڑکی سے ایک بار پھر شانزے لیزے کی بے فکر شام میں گم ہوگئی۔

عجیب علاقہ تھا یہ! سورج ڈھلتے ہی یوں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا کی تمام مسرتیں، قہقہے، خوشیاں، بےفکری، انسانوں کے روپ میں یہاں ہمکنے لگتی تھیں ـــــ میں اکثر سوچتی کہ میں تو اس علاقے کا حصہ ہوں لیکن یہ خوشیاں میرا حصہ کیوں نہیں؟ ـــــ یہ شام میری زندگی میں کیوں نہیں اترتی؟ ـــــ اپنی اکتیس سالہ زندگی میں جب سے ہوش سنبھالا ہے، دن تھکاتے رہے اور راتیں پابند کرتی رہیں۔ میری اپنی مرضی کیا ہے؟ ـــــ خواہشات کیسی ہیں؟ ان سب باتوں کے لیے مجھے کبھی وقت نہیں ملا۔

"کیا بات ہے۔ کوئی پریشانی؟" مینجر کی آواز مجھے ایک بار پھر ہوش کی دنیا میں لے آئی تھی۔

"نہیں ـــــ یہی سوچ رہی تھی کہ باہر کی اس مستی، اس بےفکری میں میرا حصہ کیوں نہیں ہے؟" ـــــ میں نے آہستہ سے کہا۔

"سارا دن تمہارا اپنا ہوتا ہے ___ بس رات کے چند گھنٹے ہی تو کام ہوتا ہے" ___ مینجر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہوں! ___ تم ٹھیک کہتے ہو!" ___ میں نے کہا اور کھڑکی بند کر دی۔ اس کے ساتھ ہی فرانس کے اس بارونق علاقے کی رونقیں بھی بند ہو گیئں اور میں کمرے سے نکل کر شراب خانے کے ہال کی طرف چل دی ___ جہاں میرا انتظار ہو رہا تھا ___ میں پیدائشی طور پر رقاصہ ہوں اور رقص کے دائروں میں ہی آنکھ کھولی۔

پچھلے بیس برسوں سے ناچتی چلی آرہی ہوں۔ لوگ تو کہتے ہیں کہ عورت چاہے تو ساری دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچادے مگر وہ نہ جانے کون سی عورتیں ہوں گی؟ میں تو باوجود چاہنے کے ایسا نہ کر سکی بلکہ ردِ عمل یہ ہوا کہ میں مقررہ گھنٹوں کے علاوہ پوری پوری رات ناچتی اور پھر تھک کر کسی کی باہوں میں گر کر سو جاتی۔ اس روز بھی شبینہ رقص کے پہلے راؤنڈ کے بعد لوگوں کے شور میں ہنستی، کھلکھلاتی میزوں کے گرد بیٹھے افراد کی طرف بڑھی۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ میں اس کے پاس چند لمحوں کے لیے بیٹھ جاؤں اور میں مسکراتی ہوئی کبھی ایک میز کے پاس رک جاتی اور غور سے چند لمحے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مرد کو دیکھتی جس کی آنکھیں اجلانے جذبے سے چمکنے لگتیں۔ پھر اس کو مایوس کر کے دوسری میز کی طرف چلی جاتی۔ مجھے اس کھیل میں بڑا مزا آتا تھا۔ بے حد سکون ملتا تھا۔ کئی نوجوان خوبصورت، نوخیز، نیم عریاں لڑکیوں کے ساتھ آتے تھے۔ جو دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں کھوئے رہتے۔ مجھے ان جوڑوں پر بے حد پیار آتا اور نہ جانے کیوں ان کے سامنے سے میں بے حد دبے قدموں نظریں جھکا کر گزرتی۔ وہ اس وقت ایک ایسی ماورائی کیفیت سے دو چار ہوتے تھے کہ ان کو چھیڑنا ایسا ہی ہے جیسے کسی عبادت گاہ کے تقدس کو برباد کرنا! تب . . . . . اچانک میری نظر کونے کی میز پر پڑی جہاں ایک سانولا سلونا نوجوان تنہا بیٹھا شراب پیے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک نظر اسے بغور دیکھا اور قدم بڑھائے کہ اچانک دوسرے راؤنڈ کے ساز بجنے لگے۔ دورانِ رقص بھی

میں اس نوجوان کو دیکھتی رہی۔ وہ بالکل اسی طرح اسی انداز میں بیٹھا تھا۔ یہ میری انا پر گہری ضرب تھی۔ ایک چیلنج تھا میرے لیے۔ . . . . سینکڑوں نظریں میرے دل کش جسم کے نشیب و فراز کو خراجِ تحسین پیش کر رہی تھیں مگر وہ احمق نوجوان . . . جیسے اسے کسی چیز کا احساس تک نہ تھا۔

دوسرا راؤنڈ ختم ہوتے ہی میں تیر کی طرح اس کی میز کی طرف بڑھی اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ خالی خالی نظروں اور بے تاثر چہرہ لیے میری طرف دیکھتا رہا پھر غنودہ آواز میں بولا:

"آپ بغیر پوچھے کیوں بیٹھ گئی ہیں؟"

میں اس کا سوال سن کر تلملا گئی مگر بظاہر مسکرا کر بولی: "کیوں۔ کیا آپ کو ناگوار گزرا؟"

"قطعی نہیں ـــــ میں تو یورپ کی تہذیب کو دیکھ رہا تھا۔" اس نے بھرپور وار کیا۔

"تم کہاں کے ہو؟" میرے جملے میں شعلے کی لپک تھی۔

"پاکستانی!" اس نے مختصراً کہا۔

"ہا، ہا . . . . پاکستانی؟ اور اس قدر ٹھنڈے"۔ میں نے زور کا قہقہہ لگایا۔

"میں سمجھا نہیں؟" اس نے بوتل کے بچے کھچے قطرے گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"میرا واسطہ بہت سے پاکستانیوں سے پڑ چکا ہے۔ وہ تو محض ایک بوسے، میری ایک نظرِ کرم کی خاطر رات رات بھر میرے کمرے کے سامنے بیٹھے رہتے تھے"۔ میں نے اسے تلخ حقیقت بتائی۔

"نہیں، تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ پاکستانی نہیں ہوں گے"۔ اس کے لہجے میں یقین تھا۔

اب سازوں کے سُر بدل چکے تھے۔ مختلف جوڑے اٹھ اٹھ کر رقص کے لیے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس قدر چیخ دھاڑ مچی ہوئی تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"چلو، تم رقص نہیں کرو گے؟" میں نے اسے دعوت دیتے ہوئے ہاتھ بڑھایا مگر وہ بے حس

بیٹھا رہا۔

"چلو—" میں نے اصرار کیا۔

"نہیں — میں عورت کے تقدس کو پامال نہیں کر سکتا۔" اس نے ایک جھلتی نظر میرے اوپر ڈالتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟ —" میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔

"مطلب یہ کہ میں اپنی ذات...... اپنے وجود تک تو برائیوں کی پہنچ کو جائز سمجھتا ہوں مگر کسی عورت تک اپنی برائیاں نہیں پہنچانا چاہتا۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر تو تمہیں کسی کلیسا میں پادری ہونا چاہیے تھا۔ یہاں کیا کرنے آگئے؟" میں نے تلخ لہجے میں بظاہر مسکرا کر کہا۔

"ہر انسان میں ایک پادری پوشیدہ ہوتا ہے اور ہر پادری میں ایک انسان۔ اگر تم پادری اور انسان کو اچھائی اور برائی کا نشان سمجھتی ہو۔" اس نے حسبِ معمول اسی سنجیدہ آواز میں کہا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ شراب جیسی طاقت ور چیز بھی اسے میری طرف مائل نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ ساری رات میں نے تنہا ہی اپنے کمرے میں گزاری۔ کتنے بے قرار لوگ میری طرف لپکے مگر میں نے ہر ایک کی پیش کش کو رد کر دیا۔ نہ جانے کیوں پہلی بار میں عجیب سے احساسات سے دوچار ہوئی تھی اور اسی رات شاید اپنی یاد میں پہلی بار جی کھول کر روئی۔ اپنی توہین پہ نہیں، اپنی بے خانمانی پر، اپنی بے بسی پہ، اپنی زندگی پر۔ اگلی شب کی آس میں میں پوری رات نہیں سوئی۔

دوسری رات میں اس سج دھج سے مے خانے میں داخل ہوئی کہ دیکھنے والوں کی چیخیں نکل گئیں۔ اس رات میں نے ایسا ہیجان انگیز رقص کیا کہ بیٹھے ہوئے لوگوں کو سکتہ ہو گیا۔ میری نظریں بھٹک کر اسی میز پہ جا رہی تھیں جہاں کل شب وہ نوجوان بیٹھا تھا جس نے فقط چند لمحوں میں میرے جذبات کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔

چار روز گزر گئے مگر اس کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ ہونہہ! ہوگا کوئی سیر و تفریح کا رسیا۔ ایسے ہی ادھر نکل آیا ہوگا۔ میں نے دل کو جھنجھلا کر تسلی دی اور پھر بظاہر معمولات میں لگ گئی۔ میں ناچتی رہی۔ قہقہے لگاتی رہی۔ اٹھکیلیاں کرتی رہی۔ لوگوں کے دل لبھاتی رہی مگر ایک خلش سی تھی۔ ایک پھانس سی جیسے کہیں اٹک گئی تھی۔

اور پھر ــــ اتوار کی شب جیسے مجھے سکتہ ہو گیا۔ میں کھل اٹھی۔ وہ اپنی مخصوص میز پر بیٹھا سر جھکائے شراب پی رہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس گئی۔

"تم ایک ہفتے سے کہاں تھے؟" میں نے بے چینی اور خوشی سے پوچھا۔

"کیوں؟ کیا میرا انتظار کر رہی تھیں؟" اس نے اپنی گھنی پلکوں کو اٹھاتے ہوئے بے جذبہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں"۔ میں اس کے قریب بیٹھتی ہوئی بولی۔

"مجھے دکھ ہوا سن کر"۔ اس نے چھت پر لگے مدھم بلب کو گھورتے ہوئے کہا اور ایک لمحہ کو جیسے میری روح تک سرشار ہو گئی۔

"واقعی؟" میں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! تمہاری زندگی کس قدر اذیت ناک ہے جس میں فقط انتظار ہی انتظار ہے اور بس"۔ وہ آہستہ سے بولا۔

میں جیسے بجھ سی گئی۔

ساز بجنے شروع ہو گئے تھے۔ میں مرے قدموں سے رقص کے لیے اٹھ گئی۔ پھر تین راؤنڈ تک اس کے پاس نہیں آئی۔ اس لیے نہیں کہ میں ہار چکی تھی۔ مجھ میں ہمت نہ تھی بلکہ اب میں وہ حربہ آزما رہی تھی جو ازل سے عورت آزماتی چلی آئی ہے یعنی مرد سے کھنچنے کا۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ وہ قدموں میں لوٹنے لگے اور میری تو اب فطرت ہی یہی بن چکی تھی۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو تھا۔ میں رقص کرتے کرتے تھک کر شل ہو چکی تھی۔ میں نے خود کو

اس نووارد تک پہنچنے سے کس مشکل سے روکا تھا یہ میرا ہی دل جانتا ہے مگر وہ تو نہ جانے کب کا اٹھ کر جا چکا تھا اور پھر وہ مجھے نظر نہ آیا۔

کتنی ہفتوں بعد۔۔۔۔۔

ایک روز میں ایک دکان سے مسکن دوائیں خریدنے گئی تو وہ مجھے نظر آیا۔ وہ اسی دکان پر کھڑا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ زیادہ حسین، زیادہ وجیہہ اور زیادہ قد آور لگ رہا تھا۔

"سنو! —" میں نے پکارا۔

"ہاں مادام! —" وہ ایک دم مڑا اور ٹھٹک سا گیا۔ "کہیے کیا چاہیے!" اس نے معمول پر آتے ہوئے پوچھا۔

"تم اس دکان پر کام کرتے ہو؟ —" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے دوست کی ہے۔ وہ کسی کام سے گیا ہوا ہے مگر۔۔۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہی ہیں"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم! تم شاید مجھے پہچانتے نہیں"۔ میرے وجود سے دکھ کراہا۔

"نن۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ کہیں دیکھا تو ہے۔" وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

پھر جب میں نے اسے بتایا تو ایک لمحہ کو وہ حیران سا ہو گیا۔

"عجیب بات ہے، رات اور دن میں کس قدر فرق ہے۔ دن کی روشنی نے تو آپ کو شریف عورت بنا دیا ہے"۔

اس کے جملے نے تازیانے کا کام کیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں تمہیں آوارہ نظر آتی ہوں؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

"بے شک! جو عورت ہر رات سینکڑوں اجنبی مردوں کو اپنے جسم کے نشیب و فراز سے بہلائے وہ بھلا شریف ہو سکتی ہے؟" اس نے کہا اور میں جل کر رہ گئی۔ یہ مشرق کا گھٹیا ذہن کا مرد!

"کمال ہے تم اسے آوارگی کہتے ہو؟ یہ تو ایک فن ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔" میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں"۔ اس نے گھرے لہجے میں کہا۔

"کیوں۔ کیا تمہارے ملک میں رقاصائیں نہیں ہوتیں؟" میں نے جل کر پوچھا۔

"ہاں، ہوتی کیوں نہیں مگر ان کی اداؤں میں تم لوگوں جیسی آوارگی اور بے باکی نہیں ہوتی"۔ س نے منہ بنا کر کہا۔

وہ اپنے ملک کی ہر چیز، ہر بُری چیز میں بھی اچھائی کا پہلو نکال رہا تھا۔

"تم مشرقی سب کمینے ہوتے ہو۔ سب ایک ہی ذہن کے"۔ میں چیخ پڑی۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ ہولے سے مسکرایا جیسے کسی بچے نے انتہائی احمقانہ سی بات کہہ دی ہو۔

"جب ہی تو تمہیں وہ سارے مرد یاد ہیں جو تمہارے ایک بوسے، ایک نظرِ کرم کے انتظار میں پوری پوری رات تمہارے کمرے کے سامنے گزار دیتے تھے، اس لیے، ۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے تم ہر رات میرا انتظار کرتی تھیں، کیوں؟" وہ اسی لہجے میں ہلکے سے مسکراتا ہوا بولا اور میں بیر ٹیختی بغیر دوا لیے باہر نکل آئی۔

مارے غصے کے میری بری حالت ہو رہی تھی۔ میں کس طرح اپنی گاڑی تک پہنچی۔ یہ میرا ہی دل جانتا تھا۔

رات اپنے شباب پر تھی۔ مے خانے کی رنگینی اپنے عروج پر مگر نہ جانے کیوں میں بجھی بجھی سی تھی۔ آج غیر اختیاری طور پر نا چنے میں بہت احتیاط سے کام لیا اور وہ لباس زیب تن کیا جو اب فرانس میں متروک ہو چکا ہے۔ لوگ تو اسے فینسی ڈریس سمجھتے تھے رخہ دمیرے مینجر نے بہت کہا مگر میں نہ مانی۔ اس رات میں نے ایک بہت پرانا دھیمے سروں پر رقص کیا۔ لوگ مبہوت ہو کر دیکھتے رہے عجیب بات یہ ہے کہ لوگوں نے میرے رقص کو بہت سراہا۔

"مادموزیل! آپ ہر رات اسی لباس میں رقص کیا کریں"۔ ایک نوجوان امیرزادے نے میرے گالوں پر بھرپور بوسہ دیتے ہوئے سناٹشی لہجے میں کہا اور نہ جانے کیوں پہلی بار مجھے اپنے اس آشنا سے کراہیت کا احساس ہوا۔

"ضرور، آپ کی خواہش کیسے رد کر سکتی ہوں"۔ میں نے اس کے ہونٹ اپنی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

میں اس کی گرفت سے آزاد ہوئی تو چونک پڑی۔ وہ سامنے ہی بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کمال ہے، اتنی دیر تک میں رقص کرتی رہی مگر اس پر نظر نہیں پڑی۔ میں نے حیرت سے سوچا۔ نہ جانے کیوں میں دوبارہ اسی امیرزادے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس کی میز کی طرف بڑھ گئی اور مسکرا مسکرا کر اس امیرزادے سے باتیں کرنے لگی۔ اسے گلاس میں انڈیل انڈیل کر شراب پیش کرتی رہی۔ وہ بھی بے حد خوش تھا۔ پورے مے خانے میں اس قدر اہمیت میں کسی کو دے دوں تو اس کی خوشی کا اندازہ سوائے میرے کون کر سکتا ہے۔ "آہ! یہ مردذات، عورت کے اشارۂ ابرو پہ خدائی تک لوٹا دے، مگر۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ وہ کیسا مرد تھا؟ میرا ذہن پلٹ پلٹ کر مشرقی نوجوان کی طرف جاتا۔ میری نگاہیں بھٹک بھٹک کر اس کی نظروں سے الجھ جاتیں۔ جواب میں کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتا اور پھر شراب میں غرق ہو جاتا۔

"مادموزیل! لوگ شبینہ رقص کے منتظر ہیں، چل کر یہ لباس تبدیل کر لیجیے"۔ میرے جھلائے ہوئے مینجر نے جانے کس طرح خود پر قابو پا کر بڑی نرمی سے کہا۔

"معاف کیجیے گا موسیو! اب میں موسیو آندرے کی خواہش کے مطابق اسی لباس میں رقص کیا کروں گی"۔ میں نے ہولے سے مسکرا کر مینجر سے کہا۔

"مگر آپ کو اور لوگوں کی خواہش کا بھی تو خیال کرنا چاہیے جو۔۔۔۔۔"

"موسیو! کیا میری خواہش کوئی اہمیت نہیں رکھتی"۔ آندرے کی مردانگی کے لیے مینجر کا جملہ چیلنج تھا۔

"ن.... نہیں..... یہ بات نہیں لیکن..... مادموزیل صرف آپ کے لیے ہی تو رقص نہیں کرتیں۔ اس طرح تو پھر ایک دن یہ مے خانہ ویران ہو جائے گا" مینجر نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کڑوے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آئندہ میں یہاں قدم بھی نہیں رکھوں گا!" آندرے کھڑے ہو کر چیخا اور ساتھ میں ساز بھی بڑی تیز دھن میں چیخ پڑے۔

"موسیو آندرے! ہمارے ہاں سے لوگ ناراض ہو کر نہیں جاتے۔ ابھی کچھ دیر تو اور بیٹھیے" بار کا مالک جو حالات کا اندازہ کر چکا تھا، قریب آ کر آندرے کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں بولا اور آندرے جیسے پلٹ پڑا!

"آپ.... آپ..... اپنے مینجر کو سمجھا لیجیے۔ اب میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ میری معمولی سی خواہش کو اس طرح سے رد کر دیا جائے۔ میں اس جیسی دس عورتوں کو اپنے اشارے پر بلا سکتا ہوں"۔

وہ میری طرف پلٹ پڑا اور میں جو فتح کے نشے میں چور تھی، بالکل بے دم سی ہو کر کرسی پہ گر پڑی۔

پھر آندرے وہاں رکا نہیں تیز قدموں سے نکلتا چلا گیا۔ میرا مینجر اور بار کا مالک اس کی طرف لپکے مگر وہ واپس نہ آیا۔

"کیوں! میں نہ کہتا تھا تم شریف عورت نہیں۔ شریف عورتوں کے لیے تو مرد جان کی بازی لگا دیتے ہیں اور وہ تو تم کو ایسے چھوڑ گیا جیسے..... جیسے..... بلکہ جو تمہاری حقیقت ہے"۔ مشرقی نوجوان میری میز پہ آ چکا تھا اس کے چہرے پہ تمسخرانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جس کی بدولت آج میری یہ گت بنی تھی۔

"اوہ خوب! تو تم آنسو بھی بہا لیتی ہو"۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مم..... مم..... نکل جاؤ یہاں سے"۔ میں نے بڑی مشکل سے سخت لہجے کو نیچی

آواز میں دبا کر کہا۔

"سوچ لو! اس طرح ایک ایک کو نکالتی رہیں تو یہ مے خانہ ایک دن ویران ہو جائے گا اور تم کہیں برتن دھوتی نظر آؤ گی۔ نہیں! اگر تمہارے پاس تو فن ہے۔۔۔۔ تم فن کار ہو۔ جہاں رہو گی اپنا فن بیچو گی۔" اس نے لفظ فن پر زور دیا۔

سازوں کے سُر یک لخت کمزور پڑ گئے تھے۔

میری حالت اس قدر بُری ہو چکی تھی کہ اس سرپھرے منشرقی نوجوان کی کسی بات کا جواب نہ دے سکتی تھی۔ میں بغیر کچھ کہے سنے اٹھ کر ڈائس کی طرف بڑھی اور اس شب مجھے نہیں معلوم کہ مے خانے پر کیا گزری کیونکہ میں راستے ہی میں گر کر بے ہوش ہو چکی تھی۔

"تم بہت کمزور دماغ کی ہو۔ آخر عورت ہونا!" وہ مجھے ہسپتال دیکھنے آیا تھا، میرے سرہانے تر و تازہ پھولوں کا گلدستہ رکھتے ہوئے بولا۔

"تم، خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"اوہو، یہ تو انسانیت کے خلاف ہے۔ ایک نازک حسینہ بیمار پڑ جائے اور اس کی مزاج پُرسی بھی نہ کی جائے۔" پہلی بار مسکرا کر اس نے کوئی ڈھنگ کی بات کی تھی۔

میں نے مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں۔

میں ہسپتال سے نکلی تو اپنی پچھلی زندگی کی تمام یادیں، تمام آسائشیں وہیں چھوڑ چکی تھی یہ پیریز کی محبت کا اعجاز تھا کہ چند دنوں میں مجھ میں اتنی بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ محبت میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اس کا اندازہ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ آج تک تو لوگ مجھ سے محبتیں کرتے رہے، میرے دیوانے تھے مگر پہلی بار زندگی میں یوں ہوا کہ وہی جذبہ مجھ پر غالب آ گیا اور یہ اسی جذبہ کی کرشمہ سازی تھی کہ میں نے شراب خانے کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا تھا اور اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تمام مرد کس وجہ سے میرے پاس آتے تھے صرف اور صرف چند لمحوں کے فرار کے لیے، سکون کے لیے، اور وہ بہت حد تک اپنے اس فعل میں حق بجانب تھے۔ فرق یہ تھا کہ ان کی محبت لمحاتی ہوتی،

جبکہ میری شاید ابدی تھی۔

شام ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں اپنے فلیٹ میں بیٹھی کشیدہ کاری کر رہی تھی، ساتھ ہی پرویز کا انتظار بھی کہ گھنٹی بجی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ "آج شاید وقت سے پہلے آ گیا"۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ کتنا خوش ہو گا مجھے اس لباس میں دیکھ کر"۔۔۔۔۔ میں پرویز کا ایک شلوار قمیض اٹھا لائی تھی اور اس وقت وہی پہنے ہوئے تھی۔

گھنٹی ایک بار پھر بجی۔

میں نے پُر شوق نظروں سے دروازے کو دیکھا اور خوشی سے لہراتی ہوئی دروازہ کھولنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔

دروازے پر میرا مینجر کھڑا تھا۔

"کیوں بیٹی! مجھے اندر آنے کو نہیں کہو گی؟" اس کی مشفق آواز گونجی۔

"ن نہیں۔۔۔۔۔ آؤ پپا۔۔۔۔" میں نے کچھ ہکلاتے ہوئے کہا اور راستہ چھوڑ دیا۔

وہ تنہائی میں میرا باپ تھا اور عام لوگوں کے سامنے صرف میرا مینجر۔ وہ کافی دیر تک مجھے سمجھاتا رہا کہ میں واپس چلی آؤں مگر میں تو فیصلہ کر چکی تھی؛

"پپا! خدا کے لیے مجھے مجبور مت کرو۔ تمہاری بیٹی اپنی مرضی سے زندگی گزارنا چاہتی ہے"، میں سسک پڑی۔

"میری بچی! میں مجبور بالکل نہیں کر رہا مگر میری ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ ان مشرقیوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ اپنی روایات کے اس قدر پابند ہوتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس پابندی سے آزاد نہیں کرا سکتی۔ ان کے لیے انسانی جذبات سے بڑھ کر ان کی روایات ہیں۔ بہر کیف تمہاری جگہ ہمیشہ خالی رہے گی"۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا اور خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

میں نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔

اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک میں نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبتی ابھرتی رہی پھر اچانک پرویز کا خیال آ گیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر غسل خانے کی طرف بڑھی۔ منہ ہاتھ دھو کر ابھی آئی ہی تھی کہ گھنٹی بجی۔ میں لپک کر دروازے پر پہنچی۔ یقیناً پرویز ہی تھا۔

"کیا بات ہے؟ آج اتنی دیر کیوں کر دی؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"دیر سے؟" وہ اندر آتے ہوئے مڑ کر بولا۔ "جناب! آج تو میں، دیکھو پورے چھ منٹ وقت سے پہلے آ گیا۔" اس نے کاؤچ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ میں جلدی جلدی اس کے لیے چائے بنانے چل دی۔

"مونا!" اس نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔ "تم اتنی بدل جاؤ گی، مجھے یقین نہ تھا۔" اس نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں، کیا یہ ناممکنات میں سے ہے؟" میں نے ہلکے سے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں۔ ناممکنات میں سے تو نہیں لیکن آزاد پنچھی پابندی سہار نہیں سکتے۔" وہ بولا۔

"مگر میں پنچھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"ہوں!" ۔ ۔ ۔ ۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک بنڈل میری طرف اچھال دیا۔ "یہ دیکھو آج ہی میری بہن کی شادی کی تصاویر آئی ہیں۔"

میں تصویروں کا بنڈل کھول کر اس کے برابر جا بیٹھی۔ "مجھے بتاتے جاؤ۔"

وہ ایک ایک تصویر کے بارے میں تفصیل سے بتاتا رہا۔ اس کی بہن بہت حسین تھی، بالکل اسی کی طرح۔ مجھے جانے کیوں سرخ سرخ کپڑوں میں لپٹی اس کامنی سی لڑکی پر رشک آ رہا تھا، جو پرویز کی بہن تھی۔

"اوہ! یہ دیکھو یہ میرے والدین۔ ۔ ۔ ۔ یہ والدہ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ یہ بڑی بہن۔ ۔ ۔ ۔ یہ چھوٹا بھائی۔ ۔ ۔ ۔" وہ نہ جانے کس کس کے بارے میں کیا کیا بتاتا رہا مگر میں جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ یہ سب مجھے بہت اچھا۔ ۔ ۔ ۔ بہت پراسرار۔ ۔ ۔ ۔ بہت اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔

"کیا خیال ہے آج پکچر پر نہ چلیں ؟" پروین کی آواز مجھے سہانے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لائی۔

"ہاں ، ضرور ، مگر کہاں ؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"شانزے لیزے کی طرف"۔ اس نے کہا۔

"شانزے لیزے ؟" میں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"کیوں ! وہاں جانا منع ہے ؟" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ بات نہیں بلکہ تقریباً ایک ماہ سے ہم ادھر گئے ہی نہیں" میں نے کہا۔۔۔۔۔

"اب کس لیے جاؤں ؟ ویسے وہ علاقہ مجھے بہت پسند ہے۔ زندگی سے بھرپور اور۔۔۔۔

اور۔۔۔۔ آخر میں نے تم کو وہیں سے تو پایا ہے"۔ اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی تو میں نے بے خود ہو کر اس کے سینے سے سر ٹکا دیا۔

نہ جانے کیوں جب بھی وہ مجھے اپنی باہوں میں لیتا ، مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے دنیا کے مصائب سے مجھے چھٹکارا مل گیا ہو۔ شاید دنیا کی عورت اسی تحفظ کی خواہاں ہوتی ہے جبھی تو وہ مرد پر فوراً اعتبار کر لیتی ہے۔ بغیر یہ جانے بوجھے کہ آگے کیا ہوگا ؟ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے۔۔۔۔ ایک سہمی ہوئی چھوٹی سی بچی میرے سینے میں پناہ ڈھونڈ رہی ہے "۔ اس نے میرے بال منتشر کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"بچی۔۔۔۔" اور میں ایک گول مٹول خوبصورت سی بچی کے تصور میں گم ہو گئی اور اپنے خیالوں میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

ان دنوں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایک ایک لفظ میرے سامنے پوری زندگی کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا تھا۔

"اچھا۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔ ورنہ دیر ہو جائے گی"۔ پرویز نے آہستگی سے مجھے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

اور میں جیسے تشنہ سی، بجھی بجھی سی الگ ہو گئی۔

"ہاں چلو!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟" پرویز نے پوچھا۔

"کچھ نہیں پرویز!..... اتنے قریب رہ کر بھی ہم میں کتنی دوری ہے۔" میں نے آہستہ سے تکلیف دہ حقیقت کا اظہار کیا۔

"اوہ! مونا میری جان!..... قربتوں کے حصول کے لیے بہت فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں۔" وہ آہستہ سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"عجیب فلسفہ ہے اس شخص کا بھی" میں حیرت سے سوچتی رہ گئی۔

ابھی فلم شروع ہونے میں دیر تھی۔ ہم دونوں فٹ پاتھ پہ پڑی ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ہر طرف رنگا رنگ ملبوسات میں نوجوان لڑکے لڑکیاں، عورتیں، بوڑھے آرہے تھے، جارہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔

"یہ لباس تمہارے اوپر بہت جچ رہا ہے۔" پرویز نے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چلو، تم کو خیال تو آگیا" میں نے ہنس کر جواب دیا۔

"خیال تو گھر میں داخل ہوتے ہی آگیا تھا مگر میں تمہارے صبر کا امتحان لے رہا تھا کہ دیکھوں تم خود توجہ دلاتی ہو..... یا میری توجہ کا انتظار کرتی ہو" اس نے کافی کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں میں کس قدر احساسِ "میں" ہے.....؟"

"حالانکہ بظاہر ہم کچھ بھی نہیں....." اس نے میری بات کاٹ کر کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"چلو..... ابھی ٹکٹ بھی لینا ہے"۔

میں ایک معمول کی طرح کافی ادھوری چھوڑ کر اس کے ساتھ چل دی۔ حالانکہ اگر عام حالات میں میرے ساتھ کوئی اس طرح کرتا تو میرا ردِ عمل بالکل ہی مختلف ہوتا مگر اب تو حالات بہت

بدل چکے تھے۔ میری ہر چیز میں زبردست تغیر آچکا تھا۔

"کہو، کب کر رہی ہو پرویز سے شادی؟"۔۔۔۔ لیزلی نے جو میری بہت عزیز دوست تھی اور ہم دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی سکول سے رقص کی تربیت حاصل کی تھی، باورچی خانے میں میرے ساتھ کھانا پکاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں دیکھو۔ جلد ہی ہو گی" میں نے ٹالنے والا جواب دیا۔

"اونہوں۔ ایسے نہیں۔ سچ بتاؤ۔" اس نے میرے کاندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

"پتہ نہیں! ابھی تو اس سلسلے میں کوئی واضح بات نہیں ہوئی" میں نے کہا۔

"کمال ہے۔ اتنے دنوں سے تم دونوں ساتھ ہو مگر سب سے اہم بات کا تذکرہ تک نہیں ہوا!"۔۔۔۔ وہ کچھ حیرت سے بولی۔

"میں چاہتی ہوں وہ خود ہی میری خواہش کرے یعنی خود ہی شادی کے لیے کہے" میں بولی اور لیزلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"واہ! یہ کیا بات ہوئی۔ تم نے کہا، اس نے کہا، بات تو برابر ہوئی نا! معاملہ تو ایک ہی ہوا۔۔۔۔"

"وہ کہتا ہے ہمارے ہاں لڑکیاں نہ محبت کے اظہار میں پہل کرتی ہیں اور نہ خود شادی کے لیے کہتی ہیں" میں نے ڈولتے دل کو سنبھالتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔

"تو گویا وہ بھی۔۔۔۔ تمہارے اس حسین جسم کا خریدار ہے۔۔۔۔ اور جس کا کوئی معاوضہ بھی نہیں۔ آخر تم نے ایک ایسے شخص کے لیے کہ جس کا کچھ پتہ بھی نہیں، اپنی ہر چیز کیوں چھوڑ دی۔ تمہارے پرستار، تمہارے چاہنے والے، اور۔۔۔۔"

"خدا کے لیے بس کرو! مت یاد دلاؤ مجھے سب کچھ، میں اب وہ سب کچھ بھول چکی ہوں"۔ میں نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن مونا! تم خود سوچو!! تم کیا تھیں اور کیا ہوگئیں۔ آخر کب تک ایسے کام چلاؤ گی۔ اس طرح تو وہ اپنا مطلب پورا کرتا ہے گا مگر تم رہو گی وہی کیمرے کی رقاصہ! تم جو چاہ رہی ہو وہ صرف اور صرف ایک خواب ہے۔ پھر خود سوچو..... تم جس ماحول کی پروردہ ہو، کیا اس سے اتنی جلدی فرار حاصل کرسکتی ہو؟" لیزلی کے الفاظ انگارے بن کر میرے دل پر گر رہے تھے۔

"لیزلی! تم پرویز کو نہیں سمجھتیں۔ تم جو سمجھ رہی ہو وہ سب یکسر غلط ہے۔ اس نے مجھ سے محبت کی ہے۔ اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ۔ اس کا میرا جسم کا مرے سے تعلق ہی نہیں!" میں نے تنبیہی لہجہ میں کہا۔

"ہا! ہا! مرد اور خالی خولی زبانی محبت کرے؟ ناممکن..... تم اس کی بہن تو ہو نہیں جو اپنی محبت کا عملی اظہار نہ کرے اور تم کیسی عورت ہو جو اپنی جسمانی طلب کو دبا رہی ہو؟ کیا تمہاری خواہشات ختم ہوگئی ہیں؟ اتنا جمود کا تصور تو میں کم سے کم تم سے نہیں کرسکتی" لیزلی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اب کسی چیز کی ضرورت نہیں" میں نے کڑوی حقیقت سے منہ چرانا چاہا۔

پھر بھی وہ کافی دیر تک مجھے سمجھاتی رہی۔ اوّل تو اسے کسی طور یقین ہی نہ تھا کہ میرا اور پرویز کا مرے سے جسم کا کوئی تعلق ہی نہ تھا اور حقیقت تو یہ تھی کہ جو کچھ لیزلی کہہ رہی تھی، میرے دل کی آواز تھی، میرے جسم کی پکار تھی۔ میری اپنی شدید طلب تھی..... مگر میں پرویز کو کھونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار تو کسی نے خلوص سے مجھے چاہا تھا۔ اپنا بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ میں دو متضاد جذبوں کے درمیان بری طرح پس رہی تھی۔ بری طرح کراہ رہی تھی۔ میرا جسم تڑخ رہا تھا..... مگر نہ جانے کیوں زبان بند تھی۔ ذہن جیسے سُن ہوگیا تھا۔

"کیا بات ہے مونا! آج بہت بکھری بکھری سی لگ رہی ہو؟" پرویز نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں..... بس یونہی ذرا طبیعت مضمحل ہے"۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا اور ایک لمحہ کو جانے کیوں وہ گھبرا سا گیا۔

"مم..... مگر ہوا کیا؟" اس نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہو سکتا ہے؟ تمہارے خیال میں....." میں کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تم غسل کر لو، طبیعت ہلکی ہو جائے گی"۔ وہ نظریں چراتا ہوا بولا۔

"اگر ہر مرض کا علاج غسل کر لینا ہوتا..... تو شاید آج دنیا میں کوئی دکھ نہ ہوتا" میں نے ذرا کڑوے لہجے میں کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"یہ کون سا فلسفہ آج تم بیان کر رہی ہو، کہیں کسی سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟" اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"عملی زندگی اور فلسفہ میں زمین آسمان کا فرق ہے میں عمل پر یقین رکھتی ہوں، فلسفوں پر نہیں"۔ میں نے سرد مہری سے اس کے ہاتھ اپنے کاندھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"آخر آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟" پرویز حیرانی سے بولا۔

"پرویز! میری تمہاری ملاقات کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟" میں نے اسی ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

"بھئی میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" پرویز نے کچھ ناخوش گواری سے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا یا تم سمجھنا نہیں چاہتے؟" میں نے کہا۔

"تم بتاؤ گی نہیں تو سمجھوں گا کہاں سے؟" اس نے احتجاجاً کہا۔

"فلسفے تو خوب تمہاری سمجھ میں آجاتے ہیں اور ایک معمولی سی بات کو تم سمجھ نہیں پا رہے ہو"۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں جواب دیا۔

"آخر بات تو بتاؤ؟" وہ بولا۔

"ہر بات میں ہی بتاؤں . . . . . تم احساسات سے کیوں عاری ہو"۔ میں نے کہا۔

"اف فوہ! مونا! خدا کے لیے کچھ کہو بھی۔ مجھے الہام تو ہوتا نہیں؟" اس نے جھلاہٹ میں میرے شانے جھنجوڑ ڈالے۔

"بیکار کی باتیں مت کرو۔ تم سب کچھ جانتے بوجھتے نظر انداز کر رہے ہو"۔ میں نے چڑ کر کہا۔

"اف! تم بتاؤ تو میں سمجھوں بھی!" وہ سر پکڑ کر کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

"سنو پرویز! . . . . . تمہاری خاطر میں نے اپنی پرانی زندگی کو چھوڑ دیا۔ تمہارے ہی ایما پر میں نے ہر وہ چیز کی جسے تم نے پسند کیا اور جس کے لیے بلاشبہ مجھے بہت اذیتیں بھی اٹھانی پڑیں لیکن . . . . . لیکن . . . . . اس طرح میں کب تک جھوٹے سہاروں پر زندگی گزار سکتی ہوں۔ آخر تم شادی کیوں نہیں کرتے۔ میرے جسم کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔ میری اپنی بھی کچھ خواہشات ہیں۔ فقط روح کی پیاس بجھانے سے تو زندگی نہیں گزر سکتی"۔ میں ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"اوہ! تو یہ بات ہے!" وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بولا۔ "میں نے تو پہلے ہی کہا تھا تم آزاد پنچھی ہو۔ پابندیاں سہار نہیں سکتیں۔ بھلا اس طرح کیسے رہ سکتی ہو! واقعی یہ تو تمہارے جسم کی توہین ہے"۔ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"نہ صرف جسم کی توہین ہے بلکہ میرے پورے وجود کی ذلت ہے"۔ میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

وہ چند لمحے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا جیسے اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں وہی مونا ہوں جو کل تک اس کے اشاروں پر چل رہی تھی۔

"دیکھو مونا! میں جھوٹ بولنے سے حتی الامکان پرہیز کرتا ہوں اور وہ بھی تم سے . . . . . فی الوقت میں شادی کرنے کی حیثیت میں نہیں ہوں۔ چند ماہ بعد میری تعلیم مکمل ہو جائے گی

اور پھر نوکری۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب کہیں جاکر شادی کے بارے میں کوئی حتمی بات ہو سکتی ہے۔" اس نے کہا۔

"پرویز! میں نے جو قربانی اپنے جذبات، اپنے خیالات اور خود اپنی عادات کی دی ہے آخر وہ کسی وجہ ہی سے نا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر مجھے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو۔ ۔ ۔ ۔ !"

"تو تم واپس اسی زندگی میں چلی جاؤ گی۔ کیوں؟" ۔ ۔ ۔ ۔ پرویز نے بات کاٹ کر تیزی سے پوچھا۔

"ہاں! شاید!!" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"مونا! میری جان!!" اس نے مجھے اپنی باہوں میں بھر لیا۔ "تم مجھ پہ بھروسہ رکھو۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے علاوہ نہ پہلے کسی عورت کو میں نے اس شدت سے چاہا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور نہ چاہ سکتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ مگر تھوڑا سا صبر کر لو۔ جہاں اتنی قربانی دی ہے۔ میں جانتا ہوں تم ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہی ہو مگر یہ بھی تو سوچو کہ میرے مسائل کیا ہیں۔ پہلے تعلیم۔ پھر نوکری۔ تب شادی!" وہ دھیمے دھیمے لہجے میں بڑے پیار سے آہستہ آہستہ مجھے سمجھا رہا تھا اور میں آنکھیں بند کیے اس کی آواز کے سحر میں ڈوب رہی تھی۔ ابھر رہی تھی۔ بے خود ہو رہی تھی۔ میرے دل سے اس کے لیے ہر برائی نکل چکی تھی۔ میں پھر لمحوں میں وہی مونا بن گئی تھی جیسی کہ وہ چاہتا تھا۔

"تم یونیورسٹی میں داخلہ کیوں نہیں لے لیتیں؟" اچانک پرویز نے کہا اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تم یونیورسٹی کی بات کر رہے ہو۔ میں نے تو سکول تک کا منہ نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا تو یوں کر لو کہ کہیں نوکری کر لو۔ یہ وحشت ناک تنہائی بھی ختم ہو جائے گی اور وقت بھی اچھا کٹ جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ مگر پاکستان جا کر نوکری نہیں کرنے دوں گا۔ سمجھیں۔" اس نے میری ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

چند ہی دنوں بعد میں نے ایک دواساز کمپنی میں استقبالیہ کلرک کی نوکری کر لی۔ صبح سے

شام تک ٹیلی فون اٹنڈ کر کر کے میں اس قدر تھک جاتی کہ کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ شام میں پرویز اور میں اکثر کہیں گھومنے چلے جاتے یا کبھی اس کے اپارٹمنٹ میں کچھ وقت گزارتے یا پھر میرے فلیٹ پر۔ رات گئے تک وہ بیٹھا رہتا۔ ہم دونوں ساتھ کھانا کھاتے اور کھانے ہی کے دوران وہ اپنے خاندان، اپنی معاشرت، اپنے رسم و رواج کے بارے میں بتاتا رہتا اور میں ایک شاگرد کی طرح مؤدب بیٹھی اس کی ایک ایک بات سنتی رہتی۔

میں چرچ سے واپس آئی ہی تھی کہ پرویز آگیا:

"او ہو! بہت مذہبی ہو گئی ہو"۔ وہ ہنس کر بولا۔

"ہو گئی ہو سے کیا مراد، جناب اپنی بے ترتیب زندگی میں صرف یہی تو ایک چیز ایسی ہے جس کی میں نے ہمیشہ پابندی کی . . . . . اور یہ بات تو تم خود بھی جانتے ہو"۔ میں نے دستانے اتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ہر اتوار تم خراب کرتی ہو ورنہ تو آرام سے صبح پکنک پہ جایا جاسکتا ہے"۔ پرویز کاؤچ پہ بیٹھتا ہوا بولا۔

"ہفتہ بھی تو ہوتا ہے، میری تو چھٹی ہوتی ہے اس دن"۔ میں نے کہا۔

"مگر . . . . اس دن تو عموماً مجھے خاصی دیر تک پڑھنا ہوتا ہے یہ بھی تم جانتی ہو"۔ پرویز نے کہا۔

"ہاں۔ بہت اچھی طرح"۔ میں مسکرائی۔

"کوئی اتوار تم مجھے کیا دے سکتی ہو؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"سارا دن ہی تمہارا ہوتا ہے۔ صرف تھوڑی سی دیر، وہ بھی صبح کے وقت میں چرچ جاتی ہوں اور کون سا روز روز جانا ہوتا ہے۔ ہفتہ میں ایک ہی تو دن ہوتا ہے جب چند لمحوں کے لیے . . . . مادر امیں پہنچ جاتی ہوں"۔ میں نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔

"تمہیں مذہب سکون دیتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

بہت! اتنا زیادہ کہ میں بیان نہیں کر سکتی بلکہ کبھی کبھی تو اب خیال آتا ہے کہ کاش! میں نن ہوتی۔ کم سے کم دنیا کے جھگڑوں سے تو نجات ہو جاتی۔ بس عبادت کیا کرتی۔" میں اس کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

"تمہیں پتہ ہے۔ ہمارے مذہب میں عبادت کے طریقے میں بڑا سکون ہے۔ ہمارے مذہب میں یہ بات بہت اچھی ہے کہ رہبانیت کا کوئی تصور نہیں۔ یعنی تم دنیا میں رہ کر پُرسکون رہ سکتی ہو"۔ پرویز نے فوراً اپنے مذہب کی اچھائیاں شروع کر دیں۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تم مسلمان ہو کر تو دیکھو پھر معلوم ہوگا"۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا تھا۔

"میں کیوں مسلمان ہو جاؤں جبکہ میرا اپنا بھی مذہب ہے"۔ میں نے منہ بنا کر کہا۔

"کیا مسلمان بُرے ہوتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بُرے ہوتے تو تم سے ناطہ کیوں جوڑتی؟" میں نے سوال کیا۔

"مونا! ایک بات بتا دوں۔ ہم اور تم شادی بھی اس وقت ہی کر سکتے ہیں جب تم اسلام قبول کر لوگی"۔ پرویز کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"کیا شادی کے لیے تبدیلیٔ مذہب ضروری ہے؟" میں نے اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی خوبصورت آنکھوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ بہت زیادہ . . . . . بلکہ سب سے زیادہ اوّلین ضرورت"۔ وہ بولا۔

"تو پھر تم کرسچن ہو جاؤ۔ بات تو . . . . ."

"کیا؟ . . . . . میں اپنا مذہب بدل لوں؟" وہ میری بات کاٹ کر چیخ اٹھا۔

"تو کیا ہوا . . . . . مذہب کی تبدیلی ضروری ہے نا . . . . . تو تم ہی قربانی دے دو۔ آخر میرا بھی تو کچھ حق ہے"۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں مونا نہیں . . . . . یہ نہیں ہو سکتا . . . . . ایسا تم آئندہ سوچنا بھی مت . . . . .

ہیں...... میں..... سب کچھ کر سکتا ہوں مگر مذہب..... نہیں نہیں.... "وہ ایک دم ہی جیسے کھول سا گیا تھا۔

"جس قدر تم اپنے عقیدے پر راسخ ہو۔ اتنی ہی میں بھی ہوں"۔ میں نے کہا۔

"میں عقیدوں پر ایمان نہیں رکھتا۔ صرف اور صرف اپنے مذہب کی بات کر رہا ہوں اور اگر تم نے میرا مذہب نہیں اپنایا تو...... ہماری اولاد کا کون سا راستہ ہوگا؟ ان کو کون سا معاشرہ قبول کرے گا؟ ان کی کیا حیثیت ہوگی؟" وہ جیسے ہذیانی انداز میں بول رہا تھا۔

"بھئی! اتنی معمولی بات کو تم اس قدر اہمیت دے رہے ہو۔ ہمارے بچے تمہارے نام سے جانے جائیں گے۔ وہ جس معاشرے میں رہیں گے اسی کے فرد ہوں گے اور بس..... اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ، نہیں مونا۔ اگر تم اپنی ضد پہ قائم رہیں تو.... اوہ نہیں! یہ بات تو میرے کبھی گمان میں بھی نہ آئی"۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"چھوڑو پرویز! چلو کہیں باہر کھانے پر چلتے ہیں"۔ میں نے اسے بہلانا چاہا۔

"نہیں مونا! آج یہ بات طے ہو ہی جائے تو بہتر ہے"۔ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

"اس میں طے کرنے کی کیا بات ہے؟" میں نے "طے" پہ زور دیا۔

"اس لیے، اس لیے مونا! کہ اس دنیا میں ہم ہی بچوں کے لانے کا سبب بنیں گے۔ ان کی پوری ذمہ داری ہماری ہوگی۔ میں ان کو کسی غلط عقیدہ، کسی غلط راہ پر نہیں چلنے دوں گا"۔

اس کی یہ بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے بارود دکھا دیا ہو۔

"کیا مطلب ہے تمہارا پرویز! تم...... تم..... اب میرے مذہب کی برائی پر اُتر آئے ہو۔ میں ہر چیز برداشت کر سکتی ہوں... اور کرتی چلی آئی ہوں لیکن یہ بات قطعی نہیں، کسی صورت میرے لیے قابلِ قبول نہیں ہے.... اور کان کھول کر سن لو۔ میری اولاد

. . . میرے خون سے تخلیق پائے گی اس وجہ سے وہ میرے ہی عقیدے اور میرے ہی مذہب کی ہوگی"۔ میں نے ترنٹرخ کر کہا۔

"ہوں! تمہارا عقیدہ ۔ تمہارا مذہب ۔ تمہارے لیے کسی مذہب کی کیا اہمیت . . . . تم تو نہ جانے کتنے مذاہب کو برت چکی ہو . . . . اور ایک میری خاطر . . . . ."

"خاموش ہو جاؤ پرویز! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ اور اس وقت تم یہاں سے چلے جاؤ"۔ میں چیخ پڑی۔

"ایسی بات ہے ۔ تم اچھی طرح سوچ لو، سمجھ لو . . . فیصلہ کر کے مجھے بتا دینا . . . اگلے ہفتے تک . . . کیونکہ چند ماہ میں میں پاکستان چلا جاؤں گا"۔ یہ کہہ کر وہ میرے فلیٹ سے چلا گیا۔

"چلے جاؤ ۔ چاہے جہنّم میں!" میں غصّے میں کھول رہی تھی ۔

نہ جانے کتنی دیر سے فون کی گھنٹی بج رہی تھی مگر میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ لیزلی تھی :

"ایک خوش خبری سناؤں؟" اس کی کھنکتی آواز نے میرا غصہ تھوڑا سا کم کر دیا۔

"ہاں کہو . . . ." میں نے کہا۔

"کیا بات ہے مونا! تم خوش خبری کا لفظ سن کر بھی خوش نہیں ہوئیں؟" لیزلی نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے واہ! کیوں نہیں خوش ہوئی ۔ میں تو نوعیت سوچ رہی تھی"۔ میں نے اپنی آواز کو معمول پہ لاتے ہوئے کہا۔

"نوعیت"۔ . . . وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور میں بھی خواہ مخواہ اس کے ساتھ ہنس دی ۔

"ہوں! تو کوئی بڑی ہی بات ہے؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں! میں اگلے اتوار کو شادی کر رہی ہوں"۔ وہ بولی ۔

"ارے واقعی! مبارک ہو، کس سے؟" میں واقعی خوش ہو گئی تھی۔

"میں ابھی آؤں گی تھوڑی دیر میں تمہارے گھر تب ساری تفصیلات بتاؤں گی"۔ لیزلی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ پورا ہفتہ میں لیزلی کی شادی کی خریداری میں مصروف رہی۔ لیزلی، میں اور اس کا ہونے والا شوہر بادل، ہم دن بھر خریداری اور شام ان کے نئے خریدے ہوئے فلیٹ کو سجانے میں گزار دیتے۔

"کہو! پرویز کس حال میں ہے؟" ایک شب کھانے پر لیزلی نے پوچھا۔

میں جس تکلیف دہ ذکر سے بچنا چاہ رہی تھی وہ اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ آجکل مصروف ہے" میں نے ٹالنے والا جواب دیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟ ایک دن بھی تو تمہارے ساتھ یہاں نہیں آیا۔ خود بادل کو اس سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا" لیزلی نے بادل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کئی بار لیزلی سے پوچھا مگر مصروفیت کی وجہ سے آپ سے دریافت نہ کر سکا" بادل بولا۔

"بھئی یہ تم آپ جناب سے کیوں مخاطب کر رہے ہو؟" میں نے ہنس کر گفتگو کا رخ موڑنا چاہا لیکن وہ میری بات کاٹتا ہوا بولا:

"اس لیے کہ جتنی قربانیاں آپ نے دی ہیں میرے خیال میں کوئی عورت نہیں دے سکتی"۔

مجھے ایسا لگا جیسے گیند اچھل کر دوبارہ میرے کورٹ میں آ گئی ہو۔

"تم لوگوں کا شادی کے بعد کیا پروگرام ہے؟" میں نے دوسرا ہی موضوع چھیڑ دیا۔

وہ دونوں اپنے پروگرام بتانے لگے:

"بھئی دیکھو! شادی کے پندرہ دن تک تو بادل کہیں نہیں جائے گا کیونکہ اسے چھٹی

نہیں مل سکتی۔ اس کے بعد ہم دو ماہ یورپ کا دورہ کریں گے۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر واپس اپنے شہر۔ پھر یہ اپنی نوکری پر چلا جائے گا اور میں اپنی پر"۔ لیزلی نے ہنس کر کہا۔

"یعنی تم بھی مے خانہ چھوڑ دوگی؟" میں نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! اور کیا۔ آخر گھر کو کون سنبھالے گا۔ پھر میرے۔ ۔ ۔ ۔ بچے۔ ۔ ۔ ۔" اور اس کے چہرے پر سرخی سی لہرا گئی۔ پاول زور سے ہنس پڑا۔

لیزلی کی شادی ہوگئی تھی۔ اس قدر زبردست تغیر اس میں آگیا تھا کہ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ویسے تو وہ تھی ہی ہانسوڑ مگر اب تو یہ عالم تھا کہ بات بعد میں کرتی تھی، ہنستی پہلے تھی۔

ایک روز میں تھکی ہاری جب دفتر سے گھر آئی تو چند ہی لمحوں بعد لیزلی بھی آگئی:

"میں تو سوچ رہی تھی کہ پرویز ہوگا۔ آج دوبدو اس سے بات ہو جائے گی"۔ لیزلی ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں، آجکل وہ بہت مصروف ہے"، میں نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"سنو مونا! ہم تم بچپن کے ساتھی ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ تم وہ راتیں اور وہ دن بھول گئیں جب ہم تم دونوں بے خانماؤں کی طرح کبھی ایک جگہ رات گزارتے، کبھی دوسری جگہ۔ کیا تمہارا اور میرا اب صرف سُکھ کا ہی ناطہ رہ گیا ہے"۔ لیزلی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

مجھے ذرا سی محبت ملی تو میں بکھر گئی۔ میں نے روتے سسکتے ایک ایک بات اس کے گوش گزار کردی۔ وہ سنجیدگی سے بیٹھی سنتی رہی۔

"ہوں، تو یہ بات ہے۔ دیکھو مونا!۔ ۔ ۔ ۔ بہت ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ تم نے اس کی ہر بات مانی، جو اس نے کہا وہ کیا مگر تمہارا اپنا بھی کوئی وقار ہے۔ ۔ ۔ ۔ تم ایک عورت ہو۔ ۔ ۔ ۔ جو اگر جھک جائے تو عظمت ہے اور اگر جھکانا چاہے تو یہ اس کا حق ہے اور اب تم ہر حق لوگی۔ ۔ ۔ ۔ یاد رکھو مونا! اب تم نہیں جھکوگی"۔ اس کی حالت بہت ابتر ہو رہی تھی۔ جذبات میں وہ پرویز کو بُرا بھلا جو منہ میں آتا،

کیے جا رہی تھی۔

"اور ایسا نہ ہو تو چھوڑ دو اسے۔ تمہارے لیے کوئی کمی نہیں"۔ اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

یہ دیزہ کو چھوڑنے کا تصور۔۔۔۔ میرے لیے سوہانِ روح تھا۔

"مگر لیزلی۔۔۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں"۔ میں نے کچھ دبی آواز

سے کہا۔

"ہم دونوں؟" وہ دہاڑی۔ "یا صرف تم احمق بن رہی ہو۔ جب جی چاہے گا چلا آئے گا۔۔۔۔

جو پابندی چاہے گا لگا دے گا۔۔۔۔ آخر یہ کیا ہو گیا ہے تم کو؟ تم زندہ عورت سے بے جان

عورت کب سے بن گئی ہو؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے لیزلی! تم درست کہتی ہو۔ تم میری زیادہ ہمدرد ہو۔ میرے زیادہ قریب رہی ہو

مجھ سے زیادہ عقلمند ہو"۔ میں نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔۔۔۔ خیر یہ بات تو نہیں لیکن میری جان سونا! تم خود ہی سوچو کہ اس طرح کب تک

بسر کرو گی؟ تنہا ہی رہنا اگر مقدر تھا تو کیبرے کی زندگی کون سی بُری تھی کم سے کم وہاں تو اتنی تنہا

تو نہ تھیں"۔ لیزلی نے میری پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں، تم درست کہہ رہی ہو لیزلی"۔ میں اقرار پہ اقرار کیے جا رہی تھی کیونکہ خود لیزلی کو علم نہ تھا

کہ میں اس وقت اپنے جذبوں کی انتہا پہ پہنچی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے میں اس سے آنکھ بھی نہیں

ملا رہی تھی۔۔۔۔ مبادا، جو میرے اندر اتھل پتھل مچی ہے وہ باہر کے شور میں ختم نہ ہو جائے اور

اندر کی یہ اذیت بہرحال مجھے عزیز تھی کیونکہ یہ میری اپنی تھی۔

لیزلی تو سمجھا بجھا کر چلی گئی تھی مگر میں بالکل بے دم ہو گئی تھی اور آخر ش دو گولیاں مسکن کھا کر

بستر پہ دراز ہو گئی۔ جانے کب تک۔۔۔۔ کتنے گھنٹوں میں بے خبر سوتی رہی۔ جب آنکھ کھلی اور

گھڑی پہ نظر پڑی تو دیکھا گیارہ بج رہے ہیں۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ یا خدا! اتنی دیر تک میں

سوتی رہی۔ اٹھ کر سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ میں نے اپنے دفتر فون کر کے خرابیِ طبیعت کا بہانہ

کر دیا۔ اس کے بعد غسل کر کے باورچی خانے کا رخ کیا۔
ابھی میں چائے بنا ہی رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ "اس وقت کون ہو سکتا ہے؟"
مجھے تشویش ہوئی۔ میں دروازے پہ پہنچ گئی۔ دروازہ کھولا تو چونک پڑی۔ پرویز کھڑا تھا۔
"کیسی ہو مونا؟" اس کا چہرہ نہ جانے کیوں مجھے زرد سا لگا۔
"ٹھیک ہوں۔ تم کب جا رہے ہو؟" میں نے راستہ دیتے ہوئے بے جذبہ لہجے میں پوچھا۔
"دو ماہ تک چلا جاؤں گا۔" اس نے کہا اور اپنی مخصوص کاؤچ پر بیٹھ گیا۔
ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے بات کرنے کے لیے کسی کے پاس الفاظ نہ تھے۔
میں ناشتے کی ٹرے اٹھا لائی۔
"آج تم دفتر کیوں نہیں گئیں؟" اس نے پوچھا۔
"یونہی! جی نہیں چاہا۔" میں نے کہا۔
"تم کو ایک ہفتہ سے فون کر رہا ہوں۔ فلیٹ پر آ رہا ہوں مگر تم کہاں تھیں؟" اس نے چند لمحوں

بعد پوچھا۔
"میں کہاں جا سکتی ہوں پرویز!" میں نے خواہ مخواہ ہی ہنس کر جواب دیا۔
"میں کئی بار آیا مگر تمہارا فلیٹ لاک تھا۔" اس نے پھر کہا۔
"اوہ! ہاں! لبنیٰ کی شادی تھی نا۔ میں تو بھول ہی گئی۔" میں نے چائے کی پیالی اسے دیتے
ہوئے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔
"مونا!" کافی دیر بعد پرویز کی آواز گونجی۔
"ہاں۔ ۔ ۔ ۔" میں جو باورچی خانے جا رہی تھی، مڑ کر بولی۔
"تم ہو آؤ باورچی خانے سے۔" اس نے کہا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔
"ہاں۔ ۔ ۔ کہو!" واپس آ کر میں اس کے روبرو کھڑی ہو گئی۔
"مونا! میری جان!! اپنی ضد چھوڑ دو۔" اس نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیسی ضد؟" میں نے تجاہل سے کام لیا۔

"مونا! مونا! میں بہت پریشان ہوں۔ خدا کے لیے مان جاؤ میری بات۔" اس نے مجھے اپنی باہوں کے حصار میں لینا چاہا مگر میں آہستگی سے الگ ہو گئی۔

"پرویز! اب تک میں تمہاری ہر بات مانتی چلی آئی ہوں مگر اس بات پر کوئی سمجھوتہ ممکن ہی نہیں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ویسے تو شادی یوں ہی ہو سکتی ہے لیکن مونا! میں چاہتا ہوں کہ تم جب میری بیوی بن کر چلو تو تم کو وہی مقام میرے گھر میں ملے جو کسی بھی پاکستانی لڑکی کو میری بیوی بننے پر ملتا۔ میں نے اپنے والد کو تمہارے بارے میں لکھا تھا۔ انہوں نے بھی یہی شرط رکھی ہے کہ اگر تم مسلمان ہو جاتی ہو تو سر آنکھوں پر خوش آمدید۔۔۔۔"

"ورنہ تم کرسچن نہیں ہو گے!" میں نے بات کاٹ کر کہا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔

"پھر اس کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے تو تم کو باوجود اس کے کہ میرے ہم مذہب نہیں ہر رتبہ پر فائز کر دیا تھا مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ پرویز۔۔۔ تم محض اپنے گھر میں مجھے ایک نام نہاد مقام دلانے کے لیے اتنی بڑی بات کہہ رہے ہو۔ کیا تمہارے ہاں انسانی جذبوں، انسانی محبتوں، انسانیت کی کوئی قدر نہیں؟ کیا تمہاری ہدایات، تمہارا مذہب، ہی سب کچھ ہیں۔ کیا تمہارے مذہب نے محبت کا درس نہیں دیا؟ بتاؤ پرویز! مجھے جواب دو؟" میں نے اسے جھنجھوڑ کر کہا۔

اس کے چہرے کی زردی مزید بڑھ گئی تھی۔۔۔۔ بے چینی کی لکیریں پورے چہرے پر پھیل گئی تھیں۔

"تمہاری ہر بات درست۔۔۔ لیکن۔۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں پرویز! میرا فیصلہ تم سن چکے ہو۔" میں نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔

میں عورت ہونے کا ثبوت دے رہی تھی۔ اسے جھکنے پر مجبور کرنا چاہ رہی تھی۔ ... کہ یہ میرا حق تھا۔

"پھر کیف مونا! تم خواہ مخواہ کی ضد کر رہی ہو۔ تم نے خود کو اتنا بدل کر دیا ہے کہ شاید ہی کوئی کر سکتا ہو مگر اب.... مگر اب ذرا سی بات کے لیے تم اتنی چڑ چڑا رہی ہو!" پرویز نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ ایک لمحہ کو میں ڈول گئی لیکن میں اپنے فیصلے پر مضبوطی سے جمی رہی۔

"اگر تم اسے ذرا سی بات سمجھتے ہو تو تم کیوں نہیں اپنا لیتے؟ یہی ذرا سی بات میرے لیے سب سے اہم ہے"۔ میں نے کہا۔

"میرا تو خیر کسی طور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہ میں تم کو بتا چکا ہوں۔ پھر.... تم تو.... مونا آسانی سے یہ کام کر سکتی ہو، قباحت کیا ہے اس میں؟" اس نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا مگر میں چٹان کی طرح اپنے فیصلے پر قائم تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی تو میرے جانے میں خاصے دن ہیں۔ تم پھر سوچ لو!" پرویز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور فلیٹ سے نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد... میں جیسے پتھر کی ہو چکی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ چیخ چیخ کر روؤں مگر آنسو شاید خشک ہو چکے تھے۔ اسے جاتے دیکھ کر ایک لمحہ کو خیال آیا کہ دوڑ کر اسے روک لوں اور اس کی بات مان لوں مگر قدموں نے اپنی جگہ سے ہلنے سے انکار کر دیا۔

پرویز معمول کے مطابق آتا رہا۔ ہم دنیا بھر کی باتیں کرتے مگر وہ جیسے الجھا رہتا.... اور میرے پاس جلد ہی موضوعات ختم ہو جاتے۔ پھر ہم گھنٹوں ایک ہی چھت کے نیچے، اپنی اپنی سوچوں میں گم خاموش، بے آواز لمحے گزار دیتے۔ ایک بُرائی ہم دونوں کو قریب لے آئی تھی اور اب ایک اچھائی نے ہمیں ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر لا پٹخا تھا۔ خود مجھے حیرت تھی کہ مجھ میں یہ ضد کہاں سے آ گئی۔ شاید یہ میرے برداشت کی آخری حد تھی... میری انا پر گہری ضرب....

ہیں سب کچھ بھلا چکی تھی، یاد تھی تو اپنی ضد . . . پرویز کی ہٹ دھرمی . . . اور بس!

"سونا! میں اگلے ہفتے جا رہا ہوں"۔

یہ خبر میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دھماکے میں میرے وجود کے چیتھڑے اڑ گئے ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا!

"اچ . . . اچھا . . . کتنے عرصے کے لیے . . .؟" میں نے رکتے رکتے بڑی دقتوں سے پوچھا۔

"کچھ علم نہیں . . . تعلیم تو میری ختم ہو چکی ہے۔ اب دیکھو . . . شاید ہی واپسی کا کوئی امکان ہو"۔ اس نے گھمبیر لہجے میں سنجیدگی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں"۔ میں نے بغیر کسی ردِعمل کے کہا۔

"سونا!" کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پکارا۔

"ہاں"۔ میں جیسے کہیں دور سے بولی۔ عجیب اجنبی سی آواز تھی میری!

"سونا! میری جان! مان جاؤ میری بات!" اس نے میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔

میں چند لمحے ساکت سی اسے دیکھتی رہی اور پھر اس سے پہلے کہ میں اس کی آغوش میں سما جاتی اور وہ سب کچھ ہو جاتا جو وہ چاہ رہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے کاندھوں سے ہٹا دیے۔

"سونا!" اس کی آواز میں دنیا جہان کی حیرت تھی۔

"ہاں پرویز! میں نے تمہاری ہر بات مانی ہے۔ تمہارے اشارے پر ہر وہ کام کیا جو تم نے چاہا اپنی ہر آسائش چھوڑ دی حتیٰ کہ اپنی فطرت تک بدل دی۔ مگر . . . مگر . . . پرویز! صرف ایک بات تم سے کہہ رہی ہوں . . . اور تم . . ." میری آواز آنسوؤں میں پھنسنے لگی تھی اور وہ بے حس سا کھڑا مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں امید کے دیے روشن تھے۔ عجیب سی چمک تھی نگاہوں میں۔

میں نے بغور اسے دیکھا اور فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

"ہاں۔ ہاں! کہو مونا!" اس نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔

"تم جاؤ اپنے وطن۔ ۔ ۔ میں انتظار کروں گی کہ تم اپنا فیصلہ بدل دو۔ ۔ ۔ یا شاید انتظار نہ بھی کر سکوں"۔ میں نے کہا۔

"دنیا بڑی عجیب جگہ ہے مونا! یہاں ملن بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ بچھڑنا اتنی ہی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ اور بچھڑے ہوؤں سے دوبارہ ملنا، شاید ہی ہوتا ہے۔ پتہ نہیں ہم بچھڑے تو مل بھی پائیں گے یا نہیں"۔ اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

"نہیں پرویز! دنیا بہت چھوٹی جگہ ہے۔ بچھڑے ہوؤں کا ملن کوئی مشکل نہیں۔ ۔ ۔ ۔ جذبے سلامت رہیں تو۔ ۔ ۔ ملن کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ ۔ ۔ کوئی رکاوٹ نہیں آ سکتی راہ میں۔ ۔ ۔ لیکن پرویز! اگر جذبے ہی مر جائیں، لگن ختم ہو جائے تب انسان کا ملنا۔ ۔ ۔ بہت مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے"۔ میری آواز پھر آنسوؤں میں پھنسنے لگی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اب۔ ۔ ۔ ۔ کہانی ختم۔ ۔ ۔ ۔ ہم دو کردار جو دو علیحدہ تہذیبوں کے نمائندے تھے، الگ الگ مذہب کے پیروکار تھے۔ ۔ ۔ ہمارا ملنا بہت مشکل تھا۔ بے حد کٹھن بلکہ ناممکن سا۔ پتہ نہیں کیوں ساری زندگی میرے ساتھ یہ ہوتا آیا ہے کہ۔ ۔ ۔ ہر چیز میرے ہاتھوں تک آ کر چلی جاتی ہے اور میں بے بسی سے خالی دامن لیے کھڑی رہ جاتی ہوں۔ شاید میرے لیے کاتب تقدیر نے یہی رقم کیا ہو۔ آخر اور بھی تو افراد ہیں دنیا میں۔ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ ان کی راہ میں تو کوئی چیز آڑے نہیں آتی۔ شاید۔ ۔ ۔ شاید۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ میری ہی غلطیاں، اور لمحہ کمزور پڑتا چلا گیا۔ میرے اندر کی عورت بے قرار ہو گئی۔ وہ اپنے تمام تر جذبوں کے ساتھ مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش کرنے لگی:

"پرویز!" ایک تڑپ میرے منہ سے نکلی اور میں اس کی بھری بھری باہوں میں سما گئی۔

شاید قرن بیت گئے۔ میں مدہوش سی آنکھیں بند کیے اس کے سینے سے لگی سسکتی رہی۔ روتی رہی۔ ۔ ۔ وہ خاموش رہا۔ بس اس کے پھسلتے ہوئے ہاتھ میرے جسم کو دلاسہ دے رہے تھے۔

ہر اُن کہا جذبہ بیان کر رہے تھے۔

"ہیلو! کہاں گم ہو؟" اس روز رات میں لیزلی اور پادل میرے گھر پر آدھمکے۔

"کہیں نہیں۔ تم کب آئیں؟" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے گرمجوشی سے کہا۔

"ہم لوگ پرسوں واپس آگئے تھے۔" پادل بولا۔

پھر کافی دیر تک وہ دونوں میرے پاس بیٹھے رہے۔ لیزلی خوشی خوشی اپنے یورپ کے دورے کے دلچسپ واقعات سناتی رہی۔ پادل کی محبت کے نشے میں چور، لڑکھڑاتی سی آواز میں روداد محبت بیان کرتی رہی۔ . . . اور میں سُن سی بیٹھی . . . سنتی رہی۔

"آپ کو ایک خوشخبری اور سنائیں۔" پادل کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"ہاں کہو۔" میں بہت کچھ جیسے جان کر مسکرائی۔

"ہم دونوں . . . مما پپا بننے والے ہیں۔" پادل زور سے ہنسا اور لیزلی کے چہرے پر ممتا کا نور پھوٹ پڑا۔

پرویز چلا گیا!

چند دنوں تک تو میں جیسے بکھر کر رہ گئی۔ ان دنوں لیزلی نے مجھے سہارا دیا۔ وہ میرے ہی پاس چند دنوں کے لیے آکر رہ گئی تھی۔ رات گئے دیر تک وہ مجھے نصیحتیں کرتی۔ میرے اقدام کو سراہتی۔ اکثر پادل بھی آجاتا اور اس طرح آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔ میری زندگی ایک بندھے ٹکے ڈھرے پر چل پڑی تھی۔ بظاہر میں بالکل مطمئن ہو گئی تھی۔ انسان کرے بھی کیا . . . اسے اپنی مجبوریوں سے سمجھوتے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اگر زندگی میں سمجھوتے کی گنجائش نہ ہو تو آدمی یقیناً پاگل ہو جائے۔

بڑی دیر سے گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ . . . میں گھنٹی کی آواز سے بے طرح چونک پڑی۔ یہ انداز . . . یہ انداز . . . مگر پھر ذہن سے سب کچھ جھٹک کر . . . دروازے کی طرف بڑھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور جیسے زمین نے میرے قدم تھام لیے . . . وقت کی گردش رک گئی . . . ہر چیز ساکت ہو گئی . . . میری نگاہیں جیسے پتھرا گئیں۔ دروازے پر پرویز کھڑا تھا . .

اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ۔ آج اس کے وجود سے جیسے کسی چیز کے ٹوٹنے کا احساس سا ہوا۔
"مونا!.... مونا! میں ہار گیا.... تم جیت گئیں..... میں تمہیں..... تمہاری ہی شرطوں پہ لینے آیا ہوں۔ چلو مونا! میرے سب لوگ تمہارے انتظار میں ہیں۔" وہ بے قراری سے بولتا ہوا آگے کو بڑھا۔

میں نے آہستہ سے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا۔
"مونا! دیکھو تو تمہاری محبت، تمہاری چاہت.... مجھے دوبارہ آخر لے ہی آئی۔" اس نے میری طرف لپکتے ہوئے کہا۔
"پرویز! آرام سے بیٹھ جاؤ۔" میں نے جانے کیسے اپنے پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔
"اوہ! یہاں کی تو ہر چیز ہی بدل گئی..... یہ... یہ لیزلی کی تصویر ہے؟" اس نے حیرت سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر لیزلی اور راول کی بڑی سی رنگین تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
"ہاں... یہ دونوں... پچھلے ماہ ایک حادثے میں مجھ سے بچھڑ گئے۔" میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔
اسے کیا معلوم اتنے عرصے میں، میں کن صدمات سے گزری، کون کون سے حادثات میرے ذہن پہ بیت گئے؟ مگر اسے تو صرف اپنی بے قراریوں کا احساس تھا... اپنی تکلیف کا خیال تھا اور بس!
"مونا! میری جان..... تمہیں کیا معلوم کہ میں تمہارے لیے کیسا کیسا تڑپا ہوں.... کتنی بے خواب راتیں تمہاری یاد میں گزاری ہیں.... کتنے بے کیف دن تم سے بچھڑ کر ملے ہیں...."
"باوجود اتنی بے قراریوں، اتنے رت جگوں کے بعد پرویز..... تمہیں دو برس.... پورے چوبیس ماہ بعد میرا خیال آیا؟ باوجود اپنے بے کیف دنوں کے تم نے پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ میں زندہ ہوں یا مر گئی؟ میرے اوپر ان دو برسوں نے کیا کیا ستم ڈھائے؟ میں واپس اپنی پرانی زندگی میں چلی گئی..... یا ابھی بھی وہیں ہوں جہاں سے سفر شروع کیا تھا؟" میرے دل میں چھپی ہوئی اس کی

محبت بلک اٹھی۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ کیا کرتا جان۔۔۔ میں مجبور تھا۔۔۔ میں"۔۔۔ وہ بے قراری سے میری طرف بڑھا۔۔۔ اور میں خاموشی سے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

"تم اپنی روایات کے آگے مجبور تھے۔۔۔ تم اپنے مذہب کے آگے مجبور تھے۔۔۔ خوب ۔۔۔ اچھے ڈھکوسلے بنائے ہیں تم نے مجبوری کے پرویز! جو کچھ تمہارے اوپر بیت جائے وہی اصل ہے۔۔۔ میں تو۔۔۔ میرا تو۔۔۔ میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔۔۔ نہ میرے جذبات ہیں نہ دل نہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، کیوں پرویز؟؟" میں نے پوچھا۔

"مونا!" اس کے لہجے میں ہلکا سا تحیر تھا یا شاید شکست کی آواز تھی۔۔۔ "مونا! حادثے انسانوں ہی کے ساتھ ہوتے ہیں، مصائب سے انسان ہی گزرتا ہے۔ وصال اور ملن تو۔۔۔ تقدیر سے ہوتا ہے۔۔۔ انسان کتنا مجبور ہے تم کو شاید اس کا اندازہ نہیں!" پرویز جیسے بلک اٹھا اور میرا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔

"نہیں پرویز! مجھے پورا اندازہ ہے، صد فیصد علم ہے کہ انسان کس قدر مجبور ہے۔ کتنا بے بس ہے، کس حد تک بے دست و پا ہے۔۔۔ اور یہ کہ تمہاری یہ بات کہ وصال اور ملن تقدیر ہی سے ہوتا ہے میرا ایمان ہے۔ آدمی جب کسی سے ملنے کو تڑپتا ہے تو تقدیر اسے اٹھا کر دور پٹخ دیتی ہے اور جب بے حس ہو جاتا ہے تب۔۔۔ یہی تقدیر۔۔۔ بے سان وگمان کسی اور کو اس کے در پہ لے آتی ہے۔۔۔ یہ بھی تو انسان کی مجبوری ہے نا" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تم۔۔۔ میں سمجھا نہیں"۔ پرویز آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ادھر آؤ میرے ساتھ۔۔۔" میں اپنے بیڈروم کی طرف بڑھی۔ "یہ دیکھو۔ بستر پر ایک ماں کی تخلیق سو رہی ہے، میری بیٹی پرویز!۔۔۔ میں نے تو چاہا تھا کہ میری ایک خوبصورت سی گول مٹول سی بیٹی ہو جو میری اور تمہاری محبت کا ثمر ہو۔۔۔ مگر پرویز۔۔۔ یہاں بھی تقدیر نے

اپنا کرشمہ دکھایا۔ میرے بیٹی بھی ہوگئی۔ خوبصورت بھی ہے مگر اس کی تخلیق میں تمہارے وجود کا شائبہ تک نہیں۔ تمہاری محبت کی پرچھائیں تک نہیں۔" میں اپنی رو میں بولتی چلی گئی۔ "ہاں پروین۔۔! میں نے شادی کر لی۔ تم نے میری عادتیں اتنی خراب کر دی تھیں کہ میرا اپنوں میں گذرہ ممکن ہی نہ تھا۔ پھر میں نے تمہارے ہی جیسے ایک مشرقی سے ناطہ جوڑیں۔ میں کہاں تک مبہم وعدوں، بے آسرا سہاروں پہ زندگی گزارتی۔ ہر چیز کی حد ہوتی ہے پروین! مجھے بھی تو ایک گھر چاہیے تھا۔۔۔ ایک شوہر کی ضرورت تھی۔۔۔ بچوں کی خواہش تھی۔ بقول تمہارے میں کبھی آزاد پنچھی تھی۔۔۔ مگر تم نے ہی مجھے قفس کی عادت ڈال دی تھی۔ کیسے صیاد ہو کہ پنچھی کو قید کر کے دوبارہ کھلے آسمان تلے پرواز کے لیے چھوڑ گئے۔ بتاؤ پروین!۔۔۔ اس میں قصور کس کا ہے؟ تمہارا۔۔۔ میرا۔۔۔ یا تقدیر کا؟" میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"اوہ مونا! تم یہاں بھی مجھ سے جیت گئیں۔۔۔۔ ہر گام پہ بظاہر میں فاتح تھا لیکن حقیقتاً تم مجھے شکست دیتی چلی آئی ہو۔" اس نے دل شکستہ سی آواز میں کہا۔۔۔ اور مڑ کر جانے لگا۔

میرا وجود ایک لمحہ کو کپکپایا اور اس کو روکنے کو ہلکا سا کسمسایا... زبان نے کچھ اور ہی کہا:

"پروین! حادثے انسانوں ہی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے تم اسے سہار لو گے"۔ میرے بے حس وجود سے تکلیف کراہی۔

اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا اور بغیر کچھ کہے دروازے سے نکل گیا۔

"پرویز۔۔۔ پرویز۔۔۔" میری روح بلک اٹھی اور میں اپنے مقصدِ حیات، اپنی مرحوم دوست لیزلی کی ایک سال کی معصوم بچی کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ دوسری بار اپنی بربادی پر۔۔۔ دوسری بار اپنی بے خانمائی پر۔۔۔ اور پہلی بار۔۔۔ اپنے عورت ہونے پر۔۔۔ مجھے اب اس کے لیے جینا تھا ایک ماں بن کر!

آنچ

"عجیب شہر ہے —— سردیاں شروع ہوتی ہیں تو برسات —— گرمیاں آتی ہیں تو بارش!" —— وہ جانے کب سے کھڑا کھڑکی سے باہر برستی بارش کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک بولا —— اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی —— "اس کی ہنسی میں آج بھی وہ کھنک ہے —— جو میرا سرمایہ حیات ہے!" وہ ہنوز باہر دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے بولا۔

"کیا بڑبڑا رہے ہو —— کھڑکی بند کر دو —— ادھر آ کر بیٹھو —— سردی لگ جائے گی!" آواز کے تحکّم پر وہ پلٹ پڑا۔

"پتہ نہیں کیوں —— اس شہر میں اب سنگینی کا احساس ہونے لگا ہے!" —— وہ صوفے میں دھنسی اپنی محبوب ہستی کی مدھم آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا جہاں وقت کی لکھی ایک داستان آج بھی ادھورے موڑ پر تھی۔ "یہ تو تمہارا اپنا شہر ہے —— یہاں کے چپّے چپّے پر تمہاری یادیں بکھری ہیں —— لمحے لمحے پر خوبصورت اور انمول گھڑیاں نقش ہیں!" —— پرانے انداز کے آتش دان میں لگے جدید طور کے ہیٹر کی آگ کی لَو تیز کرتے ہوئے وہ بولی۔

"کیا اپنے ظالم نہیں ہو سکتے؟؟" —— درد کی شکایت اسکے لہجے میں مچل اٹھی تھی —— دکھ کی آواز اس کی نظروں میں پھیل گئی تھی۔

"اس کا اندازہ کیسے ہوا؟" —— وہ اس کی نظروں سے بچتی ہوئی بولی۔

"روحی! —— ایسا لگتا ہے تم —— زندگی سے دور ہوتی جا رہی ہو —— اور ——

تم پر آہستہ آہستہ جمود کی کیفیت طاری ہوتی چلی جارہی ہے ــــ" وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوتے بولا۔

"نہیں تو ــــ منجمد تو میں ــــ ہمیشہ کی ہوں ــــ یہاں آکر تو ــ اور . . . . ."

وہ خاموش ہوگئی۔

"یہاں آکر کیا انقلاب آگیا ہے ؟" ــــ اس نے سوال کیا۔

"یہی کہ ــــ یہ جمود کہیں سے بری طرح تڑخا ہے اور ــــ اس کی دراڑیں مجھے بہت اذیت دے رہی ہیں !" ــ وہ ایک لمبی سانس لیتے ہوتے بولی۔

"یہ اذیت تم نے خود اپنے لئے چنی ہے !" ــــ وہ جھٹکے سے سیدھا ہوتے ہوئے بولا ــــ

"نہیں ــــ عارف خان ــــ نہیں ــ انسان اتنا بےبس ہے کہ وہ خود اپنے لئے کچھ نہیں کرسکتا ــــ کوئی نادیدہ اشارہ ــ شاید تقدیر کا ــ جدھر چاہتا ہے اسے ہانکتا چلا جاتا ہے !" ــــ وہ چھت پر لگے فانوس کو گھورتی ہوئی بولی۔

"تم نے کب کسی کی پرواہ کی ہے ؟" ــــ عارف خان نے ایک نظر اس کے نحیف وجود کو دیکھا اور کہا۔ پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی بس ہیٹر جلنے کی ہلکی ہلکی آواز گونج رہی تھی۔

"واقعی بڑا سنگین شہر ہے !" ــ کافی دیر بعد وہ جھکے سر کو اٹھا کر بولا۔

"پھر دورہ پڑا سنگینی کا ؟؟" ــــ روحی اس کے جگہ جگہ سے روپ کھوتے گھنے بالوں پر نظریں دوڑاتی ہوتی بولی۔

"یہاں اتنے سناٹے ہیں کہ ــــ طبیعت گھبرا سی گئی ہے !" ــ اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"مگر عارف ــــ تم کو تو سناٹے ــــ خاموشی ــــ ہمیشہ سے پسند تھے ــ تم نہیں کہتے تھے کہ ــــ بس رہنے کو تو یہی شہر ہے ۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھر بناؤں گا ــــ اور سکون سے رہوں گا ــــ یہ شہر کبھی چیختا نہیں ــــ شور نہیں مچاتا ــــ بے اماں نہیں کرتا" ــــ

اس کی آنکھوں کے سامنے سے رنگا رنگ خوبصورت ماہ و سال شریر کھلکھلاتے بچوں کی مانند اچھلتے کودتے چلے جا رہے تھے اور وہ ایک بے خودی کے عالم میں بول رہی تھی۔

"ہاں کہا کرتا تھا، لیکن کسی شرط پر تمہیں کچھ یاد ہے؟" — عارف پھر جھلا اٹھا تھا۔

"خواہشات کبھی مشروط نہیں ہوتیں — اور یہی بات کبھی اس شہر کے لئے میں نے کہی تھی تو تم بالکل اسی طرح ناراض ہوئے تھے — یاد ہے؟؟" — بیتے دنوں کی یاد نے اس کے پورے وجود کو جگمگا دیا تھا۔

"تم — ہمیشہ کی طرح آج بھی — اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتیں؟" — اس کی جھلاہٹ نے غصہ کا روپ دھار لیا تھا۔

"تم ...... مم ...... کک ...... کیا ...... اب ...... تو ......"

اور عارف کی ہنسی میں اس کا ادھورا جملہ دب کر رہ گیا۔

"ہا! ہا! ہا! — تم اب بھی وہی ہو — وہی ہو — بالکل وہی!" — وہ اس کی ہکلاہٹ پر بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔ اس کے ہنسنے کا انداز روحی کو ہمیشہ ہی بھاتا تھا۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کرکے ہنستا اس کا جی چاہتا کہ عارف اسی طرح ہنستا رہے اور وہ کھلی آنکھوں سے اسے اپنے اندر اتارتی رہے۔

"ایسا لگتا ہے تم پہلے کے مقابلے میں زیادہ دردمند اور مخلص ہو گئے ہو!" وہ اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولی جہاں بے ساختہ ہنسی نے نمی پیدا کر دی تھی۔

"وہ کیسے؟!" ہتھیلیوں سے نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے وہ بولا۔

"سنا ہے ہنسی کے دوران آنکھوں میں اترنے والے آنسو مخلص ہونے کی نشانی ہوتے ہیں!" وہ بولی۔

"یہ آنسو — خلوص کے نہیں شکست کے ہیں!" — عارف کی آواز میں لرزش تھی۔

"اتنی زندگی شکست کے احساس کے سہارے گزار دی؟" — اس نے کھلنتے

ہوئے پوچھا۔ جانے کیوں حلق میں پھندا سالگ گیا تھا۔

"ہاں ـــــ جینے کا کوئی تو سہارا چاہیئے ـــــ جب انسان ہاتھ کھینچ لیتا ہے تو سہارے کا متلاشی اپنے اندر کی ٹوٹ پھوٹ سے کوئی سہارا کھینچ نکالتا ہے!" ـــــ اس کا لہجہ ہانپ گیا تھا ـــــ

"فرار کو سہارے کا نام مت دو!" وہ مدھم آواز میں بولی۔

"تم جس آگ کے دریا سے گزری ہو ـــــ اس نے تمہیں کندن بنا دیا ہے ـــــ اور میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں!" ـــــ عارف اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

" اگر آدمی کے بس میں ہوتا ـــــ اگر وہ اپنے جینے کی راہ چلنے میں مختار ہوتا ـــ تو ـــ تو کوئی کبھی کندن بننے کی آرزو نہ کرتا!" ـــ اس کی آواز میں رعشہ اتر آیا تھا ـــ عارف کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس ایک جملے میں اس کا پورا وجود اس کی تمام خواہشات ۔ اس کے تمام حوصلے کراہ اٹھے ہوں ۔

" گویا بھسم ہو چکی ہو ۔ زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی؟" وہ اٹھ کر روحی کے قدموں میں بیٹھتا ہوا بولا ۔

" خزاں کا موسم شروع ہو چکا ہے ـــــ اب یہ برسات بھی ان خشک ٹہنیوں کو نمی نہیں دے سکتی!" ـــــ وہ کھڑکی سے باہر ٹنڈ منڈ درختوں پر گرتی موسلا دھار بارش کو دیکھتے ہوئے بولی۔

" پتہ نہیں کیوں ـــ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ ـــــ میں جب بھی تم سے ملوں گا تم ویسی ہی ہو گی جیسا کہ تم کو پہلی بار ـــــ نہیں شاید آخری بار دیکھا تھا ـــــ جب تم اس شہر ۔ اس ملک سے سب کچھ سمیٹ کر جا رہی تھیں ۔" وہ روحی کے نازک ہاتھوں کو اپنے یخ ہاتھوں سے سہلاتا ہوا بولا ۔

" کونپل سدا کونپل نہیں رہتی!" ـــــ وہ خالی نظروں سے اپنے ہاتھوں کو دیکھتی ہوئی بولی جنہوں نے محبت کا کوئی لفظ، پیار کا کوئی جملہ، چاہت کا کوئی بول عارف کے وجود پر نہیں لکھا تھا ۔

"شاداب درخت کا روپ تو دھار سکتی ہے !" وہ اس کی خالی نظروں میں بہت کچھ کا متلاشی تھا۔

"درخت پر خزاں بھی آتی ہے !" وہ بڑبڑائی۔

"ہوں ــــ اگر تم میری بات مان لیتیں ــــ تو آج خزاں اِدھر کا رُخ نہیں کر سکتی تھی ــــ تمہاری دراڑیں ــــ تمہاری بنیاد بن چکی تو ہیں !" ــــ عارف نے ٹھنڈی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے عارف خان !ــــ کہ ــ میں نے زندگی میں کوئی چیز کسی کے ساتھ شیئر (SHARE) نہیں کی ــــ مل بانٹ کر کھانے کے فلسفہ پر تو میرا ایمان ہی نہیں ہے۔ یہ بزدلوں کا شیوہ ہے ــ سہمے ہوئے لوگوں کا وطیرہ ہے ــ مجھے جب جب یہ احساس ہوا کہ میری پسندیدہ چیزیں کوئی شراکت کا خواہاں ہے ــ یا کوئی چیز مجھے پسند آئی ہو اور اس پر پہلے سے کوئی قابض ہو ــــ تب تب میں نے یکلخت ان چیزوں کو چھوڑ دیا ــــ حتیٰ کہ ماں باپ کی محبت سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میرے چھوٹے بہن بھائی جب میرے ماں باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے تو میں ــــ خود بہ خود الگ ہو جاتی ــ اور ۔۔۔"

"بالکل ایسے جیسے تم نے مجھ سے ناطہ توڑ لیا کیوں ؟؟" ــــ عارف نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں عارف ــ تنہائی کا عذاب بہتر ہے ــــ شیئر کی اذیت سے !" ــ اس نے صوفے کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ عارف خاموشی سے اٹھ کر سامنے والے صوفے پر جا بیٹھا ــ کسی گہری سوچ میں گم۔

"تمہیں پتہ ہے ــــ تمہارے انکار نے دو زندگیاں تباہ کر دیں !" ــ عارف اس کے تھکے چہرے پر نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔

"دو نہیں ــــ صرف ایک کہو ــ یہ حق مجھے کس نے دیا تھا کہ میں کئی زندگیوں

کو تباہی کی طرف دھکیل دوں!" اس نے آنکھیں نیم واکیں اور پھر سے موندلیں۔

"تمہاری سوچیں انتہا پسند ہیں ـــــ ہماری برادری میں دو شادیاں کرنا کوئی عیب نہیں ـــــ یہ بہت عام سی بات ہے ـــــ اپنی چچا زاد سے تو مجھے شادی کرنا ہی تھی ـــ مگر تم تو میری محبت تھیں ـــــ پہلی اور آخری۔ اور یہ بات میرے والدین بھی جانتے تھے۔ انہیں اس امر پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ تم کو اسی طرح بہو بنا کر لاتے جس طرح میری چچا زاد کو لاتے ـــــ مگر ـــــ مگر ـــــ تم نے کبھی میری بات پر دھیان نہ دیا ـــ اور پھر ـــــ تم تو روحی ہمارے گھر کی پسندیدہ شخصیت تھیں!" ـــــ عارف خاموش ہو گیا ـــــ روحی کا رنگ زرد ہو گیا وہ یقین جو برسوں کی پرورش کے بعد استقلال بن کر اس کے وجود میں زندہ تھا، عارف کے ایک جملے سے بھک سے اڑ گیا ـــــ تھکن اور بڑھ گئی تھی۔

"کیا بات ہے؟ ـــــ تمہارے چہرے پر اسقدر زردی چھا گئی ہے؟" ـــ چند لمحوں بعد عارف نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پریشانی بھرے لہجے میں کہا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اسی ایک لمحے میں روحی پر کیا قیامت بیت گئی، کتنی آندھیاں اٹھیں، کتنی تباہی مچی، کتنی دراڑیں پڑیں، کسقدر ٹوٹ پھوٹ مچی، اس ایک لمحے میں گزرے ہوئے ماہ و سال کو کس شدت سے اس نے پکارا کہ ہانپ ہانپ گئی ـــــ لفظوں کی تیز آنچ میں سب کچھ پگھل گیا تھا اور اب وہ سنبھلنا چاہ رہی تھی۔

"دیکھا ـــــ میں نہ کہتا تھا کہ آغا جان روحی آنٹی کے ہاں ہوں گے؟" ـــ اس کا جواں سال بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"آؤ ـــ بیٹا ـــ بیٹھو!" ـــــ روحی نے بمشکل کہا۔

آغا جان ـــ آپ بہت PALE لگ رہے ہیں" ـــ اس کی بہو نے اسے دیکھتے ہوئے پریشانی بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے بیٹا نہیں ـــــ میں ٹھیک ہوں!" ـــــ عارف نے دلاسہ دیا۔

"آغا جان شاید کافی دیر سے بیٹھے ہیں اسی وجہ سے تھکے لگ رہے ہیں !" وہ باپ کو سہارے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا ۔

" تمہاری امی کب آ رہی ہیں ؟ ___ فون کیا تھا ؟" ۔ عارف نے بیٹے کے مضبوط ہاتھوں کے سہارے اٹھتے ہوئے پوچھا ۔

" ہاں ___ کیا تھا چھوٹی آپا کی ڈیلیوری کے بعد آئیں گی " ___ بیٹے نے بتایا ۔

" آنٹی ___ کتنے مہینے ہو گئے ہمیں یہاں آئے ___ آپ بھی تو نکلئے ___ آپ نے تو اپنے آپ کو بالکل قید کر لیا ہے !" ___ اس کی بہو روحی کی طرف دیکھتی ہوئی پیار بھرے لہجے میں بولی ۔

" بیٹا ___ تمہاری آنٹی سدا سے زنجیروں میں بندھی ہیں ___ اور یہ زنجیریں انہوں نے خود اپنے لئے پسند کی ہیں " ___ وہ بیٹے بہو کے پیچھے آہستہ روی سے چلتا ہوا بولا ۔

" عارف !" ___ روحی کی لرزتی آواز نے فریاد کی ___ اور اس کے قدم پلٹ پڑے ۔

" روحی !" محبت کا خمار اس کے لہجے سے جھلک پڑا ___ وہ نہ جانے کتنی دیر تک اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتی رہی ۔ ڈھونڈتی رہی ___ گم ہوتی رہی ۔

" عارف ___ تم نے ___ تم نے ___ یہ پہلے کیوں نہ بتایا ؟" اس نے کہا اور عارف کے کاندھے پر منہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ! !

اوکلاہاما۔

عزیزِ من

آباد رہو!

چار ماہ کے طویل عرصہ میں تمہارا دوسرا خط ملا۔ کتنے جاں فزا ہوتے ہیں وہ لمحات جب کوئی پیغام اپنوں کی خوشبو کا سفیر بن کر آتے ! ـــــ میں تو ان مہینوں کو طویل عرصہ ہی کہوں گی جب آدمی ایک دن بھی انسانوں سے کٹ کر کسی جنگل میں گزار لے تو وہ ایک دن نہ جانے کتنے مہینوں پر بھاری ہوتے ہیں ـــــ اور اب جبکہ میں پچھلے چار ماہ سے انسانوں کے ایک گھنے جنگل میں مقیم ہوں ـــــ یقیناً چار صدیاں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔

سنو! ـــــ یہاں پر خزاں کا موسم شروع ہو چکا ہے ـــــ مگر تم کو خزاں سے کیا غرض تم تو صرف بہار کے متلاشی ہو ـــــ لیکن یہ خزاں مجھے کئی بہاروں سے پیاری ہے ـــــ اس خزاں میں چھپی ہوئی بہار کا اندازہ تم نہیں کر سکتے ـــــ ایک بار کہیں پڑھا تھا کہ بہار کے موسم میں طبیعت کی جولانی اپنے شباب پر ہوتی ہے ـــــ لیکن اس جملہ کا خالق اگر یہاں کی خزاں کو دیکھ لے تو مجھے یقین ہے اس کا نظریہ یکسر بدل جائے گا ـــــ! بہار کے کئی رنگ ہوتے ہیں ـــــ مگر خزاں کا فقط ایک رنگ ـــــ یعنی اداسی! ـــــ کتنی عجیب بات ہے ـــــ یہ ملک جو دنیا کا طاقتور ترین ملک ہے ـــــ یہاں پر جذبوں کے کیسے

کیسے نرم و نازک رنگ بکھرے پڑے ہیں ___ یہاں کی ہر بات نرالی ہے ___ اب یہی دیکھو ___ خزاں کا موسم ہے ___ مگر کسی قدر حسین ___ درختوں کے رنگ یکسر بدل چکے ہیں ___ سوکھے پتوں پر مریل پن نہیں بلکہ ایک عجیب سی کھلکھلاتی شادابی ہے ___ رنگوں کی ! ___ گھاس کا رنگ جو ہمارے ملک میں سوکھ کر پیلا پڑ جاتا ہے نہ جانے کس خوف سے ___ یہاں اس کا رنگ ہی اور ہے میں اس رنگ کو کوئی واضح نام نہیں دے سکتی ___ شاید یہ بھی کسی ان کہے جذبے کا رنگ ہے !

لیکن تم کو ان کہے جذبوں کی کیا پہچان ___ تم تو ہر بات سرِ محفل کہنے کے عادی ہو ___ جس میں کوئی وزن نہیں ہوتا ___ جسے سن کر کسی قسم کا جذبہ دل میں بیدار نہیں ہوتا ___ جس میں کسی احساس کی تپش نہیں ہوتی ___ ہاں چند لمحوں کی رفاقت کی خوشی ضرور ہوتی ہے ___ کہو ___ تمہارے شب و روز اسی انداز میں کٹتے ہیں یا کوئی تبدیلی ہوئی ۔

میری تو مصروفیت کا ابھی سے یہ عالم ہے کہ بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ تارِ حیات کو اس زور سے جھنجھوڑ دوں کہ اس میں چھپا ہوا ہر سُر خلاء میں بکھر کر رہ جائے اور میں ایک انجانے سے بوجھ سے آزاد ہو جاؤں ___ تم نے لکھا ہے کہ تمہیں خوشی ہے کہ میں ایک بلند مقصد کے لئے یہاں آگئی ہوں ۔

مگر عزیز میرے ! ___ انسان کا وہ کون سا بلند مقصد ہے جس کے لئے اسے اپنوں سے بیگانہ ہونے پڑے ___ اس کرب کی تشریح تم نے نہیں کی ___ میں تو فقط ___ بس یونہی چلی آئی ___ اب اگر کوئی بلند مقصد بن جاتا ہے ___ تو ___ سبحان اللہ اسی وقت دن کے دو بجے ہیں ___ میں اپنی بہن کے چھوٹے سے گھر کے بے حد مختصر باغیچے کے ایک سرے پر آرام کرسی پہ کئی گھنٹوں سے کاہلی سے پڑی ہوئی ہوں ___ میری بہن بہنوئی دو دن کی چھٹی گزارنے اپنے کسی دوست کے ہاں مانٹریال گئے ہوئے ہیں ___ وہ لوگ میری آدم بیزاری سے نالاں ہیں ___ انہیں

کیا معلوم کہ چند ماہ قبل میں کسقدر سوشل لڑکی ہوا کرتی تھی ـــــ یاد ہے انجمن آراء کا خطاب تو تم ہی نے دیا تھا ـــــ ابھی ابھی پتہ ہے میں نے کیا حرکت کی ؟ ـــــ نہ معلوم کیوں قلم کو چوم لیا ـــــ پتہ نہیں کس جذبہ کے تحت !! ـــــ بقیہ اہلِ وطن کس حال میں ہیں ضرور لکھنا ـــــ

خدا حافظ

تمہاری دوست شیری ـــــ

اوکلاہاما ـ

عزیزِ من !

شاد رہو !

سنو ! ـــــ تمہارا خط آتے ہوتے بھی تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا ہے ـــــ مگر مصروفیت کی وجہ سے فوری طور پر جواب نہ لکھ پائی ـــــ تم تو کہتے ہو کہ بے حد مصروف رہتے ہو پھر جانے کیسے اتنے طویل طویل خط لکھ لیتے ہو ؟ ـــــ تم نے لکھا ہے کہ میں تم کو خط میں بزرگوں کی طرح کیوں مخاطب کرتی ہوں ـــــ ؟ حیرت ہے تم نے ایسا کیوں سمجھا ؟ ـــــ بھئی میرا مقصد قطعی یہ نہیں کہ تم کو خورد گردانوں یا خود کو برتر جو تمہاری تحریر نے احساس دیا ـــــ تم مجھے یاد کرتے ہو ؟ ـــــ زہے نصیب مگر زندگی میں اتنی فرصت کہاں کہ کسی کو یاد رکھا جائے ـــــ یہ تو ناطے کی بات ہے، تعلق کا کھیل ہے کہ رابطہ رہا تو یاد بھی آگئی ورنہ ـــــ کچھ نہیں ـــــ اور میرا تو یقین ہے کہ جس کا کسی سے رابطہ رہتا ہے اسے یاد کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ ہے ناں ؟ ؟ ـــــ میرے شہر کی گلیوں کا کیا حال ہے ؟ ـــــ کس قدر عجیب بات ہے ہم بڑی سے بڑی کھلی سے کھلی شاہراہوں پر نکل آئیں ـــــ مگر تنگ گلیاں ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں جگمگاتی رہتی ہیں ـــــ تم نے لکھا ہے کہ تم کو وہ دوپہر

یاد ہے جب میں تم سے پہلی بار ملی تھی ــــ اور میں اس جملے کو پڑھ کر خاصی دیر تک الجھتی رہی کہ آخر اس دوپہر ایسا کون سا سانحہ رونما ہو گیا تھا؟ ــــ یہ ملن اور بچھڑنے کا کھیل تو ازل سے جاری ہے ــــ اور تا ابد رہے گا! ــــ ہاں رہی بات تمہارے شہر دل کی ــــ جس کا تذکرہ تم نے جگہ جگہ کیا ہے ــــ تو وہ تو میرے خیال میں فقط ایک مکین کا اضافہ چاہتا تھا ــــ جو ہو چکا ہے ــــ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ہوس ملک گیری کے مارے ہوئے سیاست دانوں کی طرح توسیع پسندی تمہارا بھی شیوہ ہے۔

تم جو دن میں نہ جانے کتنوں کے جذبوں کے گھروندے بناتے ہو ــــ تباہ کرتے ہو اپنے شہر دل میں کتنی عمارتیں تعمیر کرتے ہو ــــ کتنے مکینوں کو برباد کرتے ہو ــــ یہ سب سوچ کر تو جی چاہتا ہے کہ بجائے شاعر کے اگر تم ایک آمر فرماں روا ہوتے یا ــــ اور کچھ نہیں تو معمولی سول انجینئر ــــ دوسروں کے نازک جذبات کے گھروندے بنانے کے بجائے سخت پتھر اور اینٹوں سے واسطہ پڑتا تب معلوم ہوتی زندگی کی حقیقت ــــ کہ زندگی حسن، عورت، خوشبو ہی نہیں پتھر، کانٹے مصائب بھی ہے! ــــ اجازت ــــ

تمہاری دوست ؛ ــــ

بفلو

عزیز من

ناراض نہ ہو!

تمہارا جھنجھلایا ہوا خط کل ہی ملا ــــ جواب فوری دے رہی ہوں اس وجہ سے کہ اس وقت مجھے فرصت کے وہ لمحات میسر ہیں جن کے لئے پچھلے کئی مہینوں سے ترس رہی تھی ــــ معلوم ہے تم کو یہ خط کہاں سے لکھ رہی ہوں؟

اس وقت ہم سب یعنی میں میری بہن، بہنوئی ان کے کچھ احباب اور میرے دو پروفیسر نیاگرا فالز دیکھنے آئے ہیں سب لوگ باتوں میں لگے ہیں ___ میں ٹہلتی ہوئی کافی دور نکل آئی اپنے ایک پروفیسر مسٹر ونگ فیلڈ کے ساتھ ___ دیکھا تم نے ___ ان لوگوں کے نام ان کی بلند پروازی کی علامت ہیں! ___ ہم بہت دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے ___ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اپنے ملک سے دور وہاں کے بارے میں کسی اجنبی انسان سے باتیں سننا کس قدر اپنائیت کا احساس دلاتا ہے ___ ونگ فیلڈ کبھی پاکستان نہیں گئے مگر ___ ان کی معلومات ہمارے ملک کے بارے میں اسقدر مستند ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ___ سیاسی غیر یقینی، طبقاتی کشمکش ___ انتشار اور مایوسی کی فضا ___ اور یہ سچا آدمی ان سب باتوں کا ذمہ دار اپنے ملک کی پالیسیوں کو گردانتا ہے ___ سچ کسی کے بھی منہ سے نکلے اس کی توانائی بہر حال دوسرے کو متاثر کرتی ہے ___ بلکہ سر نگوں کر دیتی ہے ___ میں اور مسٹر ونگ فیلڈ باتیں کرتے کرتے کافی آگے نکل آئے تھے ___ میں ایک جگہ رک گئی۔ انہوں نے چند لمحے مجھے دیکھا اور مسکرا دیئے۔

"شاید تم ان سیڑھیوں سے اوپر جانا چاہتی ہو؟" ___ انہوں نے ایک طرف بنی اونچی جگہ سے نیچے اترتی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اور میں بغیر بولے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ سمجھدار آدمی تھے مجھے میری تنہائیوں سے باتیں کرنے کے لئے چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ اور اس وقت اوپر کھلی جگہ میں بیٹھی آبشار کو پوری قوت سے زمین کی طرف بانہیں پھیلائے بڑھتا دیکھ رہی ہوں۔ آبشار کے چھینٹے مجھ تک پہنچ رہے ہیں۔ میں بھیگ رہی ہوں، سکڑ رہی ہوں اور ذہن کے افق پھیل رہے ہیں ___ تم نے کبھی طاقت، ہیبت، شکوہ، حسن اور نزاکت یکجا دیکھے ہیں؟ ___ اگر نہیں تو اس آبشار کو دیکھو ___ قدرت کی اس صناعی کو دیکھو ___ وہ دیکھو ___ سورج نہ جانے کب کا ڈوب بھی گیا ___ شام کا سرمئی پن دودھیا آبشار پر پھیلنے لگا ہے ___

شاید اُسے بھی کسی کی ضرورت ہے ___ شاید وہ بھی محض شام کے انتظار میں دن بھر تندی و تیزی دکھاتا رہتا ہے ___ اور جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تب یہ آبشار تھکا تھکا سا شام کی بانہوں میں سمٹ آتا ہے ___ قدرت بھی کیا چیز ہے ؟ ___ کبھی سوچا ہے تم نے ؟ اس نے کیسے کیسے بندھن بنائے ہیں کبھی غور کیا ہے ؟ ___ اور یہ بندھن صرف انسانوں ہی کے لئے نہیں ہیں بلکہ قدرت کی بنائی ہوئی ہر دو چیز اس میں جکڑی ہوئی ہے ___ میرے خیال میں اب بہت بھیگ چکی ___ چلتی ہوں !

تمہاری شیری ___

اوکلاہاما ___

عزیز من !

پریشان نہ ہو ___

آج دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد تمہارا خط ملا ___ اگلے ماہ تک مجھے یہاں آئے ایک سال ہو جائے گا ___ ایک سال ___ ایک برس ___ بارہ ماہ ___ نہ جانے کتنی یادوں کو لئے اپنے ساتھ چلا یا جائے گا ___ بالکل میری طرح ___ جو نہ جانے کتنے جذبوں ، کتنی محبتوں کتنوں کے خلوص کے لئے خاموشی سے چلی آئی ___ بغیر کچھ کہے سنے ___ وقت بھی کسقدر تیزی سے گزر جاتا ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔ طول طویل دن ___ تھکا دینے والے تکلیف دہ گھنٹے کس سرعت سے لمحوں میں تبدیل ہو کر ہاتھوں سے پھسلتے ہوئے نہ جانے کہاں گم ہوتے چلے جا رہے ہیں ___ میرا آج تیزی سے کل میں تبدیل ہو رہا ہے۔ بغیر اپنا نشان چھوڑے ___ تم نے لکھا ہے کہ تم میری تحریر سے پریشان ہو گئے۔ کئی راتیں نہ سو سکے ___ لفظوں میں میرا سراپا ڈھونڈتے رہے ___ مگر دیکھو نا ___ انسان کی کوئی چیز بھی تو اپنی نہیں ___ میرے الفاظ تمہارے ہو گئے ___ میرا آپ

نہ جانے کہاں بھٹک رہا ہے ـــــ نہ جانے کب کس کا ہو جائے۔ اس اذیت کا بھی اندازہ کیا ہے تم نے؟ ـــــ انسان کی تہی دامنی ـــــ خالی ہاتھوں کے بارے میں سوچا ہے کبھی؟ ـــــ تم نے لکھا ہے کہ میں کبھی تو تمہاری زبان کا اعتبار کر لوں ـــــ کس لمحہ تم کو یہ احساس ہوا کہ تم ناقابلِ اعتبار ہو؟ ـــــ کون سی سعد گھڑی تھی جب تمہارے وجود میں پوشیدہ سچائی نے تم کو یہ جملہ لکھنے پر مجبور کر دیا؟ ـــــ تم نے لکھا ہے کہ کبھی تو میں تمہاری بات مان لیا کروں ـــــ تو سنو ـــــ میں ہر آدمی کی بات کو جو اس کے نزدیک بہتر ہو میرے نزدیک بہترین ہوتی ہے ـــــ پھر مجھے کسی کی اچھائی اپنانے کی ضرورت نہیں ـــــ کیونکہ مجھے اپنی برائیاں بے حد عزیز ہیں ـــــ تم میری تحریر پڑھ پڑھ کر الجھتے رہے ـــــ پریشان ہوتے رہے ـــــ مگر کیوں؟؟ ـــــ آخر ایسی کون سی بات میں نے لکھ دی تھی ـــــ تم تو حقیقتوں پر ایمان رکھتے ہو ـــــ پھر یہ الجھاؤ ـــــ یہ بے چینی کیوں؟ ـــــ کیا تم میں سچ سہارنے کی طاقت نہیں ہے ـــــ؟ ـــــ آج تو میرا جی بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی قسم کی خط و کتابت کروں مگر ـــــ پھر سوچا چند سطریں گھسیٹ دوں ـــــ اور دیکھو تو یہ چند سطریں پورا خط بن گئیں ـــــ واقعی انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ـــــ! ـــــ مگر میں اس بے بسی کو سلام کرتی ہوں! ـــــ کہ یہ نہ ہوتی تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا! ـــــ

تمہاری دوست!

اوکلاہاما!

اچھے دوست!

کافی عرصہ پہلے تمہارا خط مل گیا تھا ـــــ جواب آج دے رہی ہوں ـــــ تمہارا بارہ صفحوں کا خط میں نے فقط ساڑھے پانچ منٹ میں پڑھ لیا ـــــ وہی پرانی باتیں ـــــ

پہلی ملاقات، محافل میں ملاقات، یہاں ملاقات، وہاں ملاقات ــــــ ملاقاتوں کی اتنی طویل فہرست دیکھ کر تو میں واقعی پریشان ہوگئی ــــ فراق کا تو کوئی ذکر ہی نہیں ــــ فاصلوں کا تو کوئی تذکرہ ہی نہیں ــــ خیر تمہارے خط کی یہ ملاقاتیں مجھے بہت کچھ یاد دلا رہی ہیں ــــ جم خانہ کی وہ شب ــــ جب تم نے کئی لوگوں کے بیچ بیٹھ کر میری محبت کے راگ الاپے تھے ــــ اور جسے سن کر میں ہنس دی تھی ــــ تم جانتے ہو میرا تمہارا حلقۂ احباب ایک ہی ہے جہاں تم ایک دل پھینک انسان مشہور ہو جبکہ میں سنجیدہ اور بردبار لڑکی کے روپ میں پہچانی جاتی ہوں۔ مجھے وہ دوپہر یاد ہے جب میں لائبریری جانے کے لئے بس کے انتظار میں کھڑی تھی اور اچانک تم نہ جانے کہاں سے اپنی گاڑی لئے نمودار ہوئے ــــــ تم نے مجھے لفٹ دی ــــ اور پھر وہ سارا دن میں بجائے لائبریری کے تمہارے ساتھ رہی ــــ کبھی کسی پارک میں ٹہلتے ہوئے ــــ کبھی سمندر کی جگمگاتی ریت پر بے نشان قدموں سے چہل قدمی کرتے ہوئے ــــــ کبھی ڈرائیونگ کرتے ہوئے ــــــ کبھی کسی سنیک بار میں چائے پیتے ہوتے ــــ اور شام پانچ بجے اچانک لائبریری کا خیال آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی ــــــ مگر کس قدر عجیب ملاقات تھی کہ ہم چار گھنٹے ساتھ رہے ــــ مگر ــــ کوئی خاص بات نہیں ہوئی ــــ ماسوائے تعلیم نوکری، تمہاری دفتری سیاست اور تمہاری دوستوں کے ــــ اور مجھے خود پر حیرت ہوتی رہی کہ کیوں ــــــ کس وجہ سے تمہاری بات مان لی ــــ بلکہ اکثر مان لیا کرتی تھی ــــ اور وہ دن بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب تم ایک روز اچانک ہمارے گھر چلے آئے تھے ــــ اس روز ــــ میں سارا دن بہت خوش رہی ــــ حالانکہ تم تو چند لمحوں کے لئے بابا کے پاس آئے تھے کسی کی سفارش لے کر! ــــ میرے حافظے میں وہ رات بھی محفوظ ہے جب میرے بہت سے دوستوں ــــــ سہیلیوں اور والدین کے ہمراہ تم بھی مجھے ایئرپورٹ رخصت کرنے آئے تھے ــــ وہیں باتوں کے دوران میرے ایک ہم جماعت

نے کہا تھا ـــــ " شیری ـــــ اب تم ڈاکٹریٹ کر کے ہی آنا ـــــ اچھا موقع مل رہا ہے !"
اس پر میں نے کہا تھا ـــــ " نا بابا ! اتنی بڑی ڈگری مجھ سے نہیں سنبھلے گی ـــــ بس کوئی
چھوٹے موٹے کورس کر لوں گی !" ـــــ اور تم نے ـــــ جو لاتعلقی سے میرے
بالکل قریب کھڑے تھے جھک کر آہستہ سے کہا تھا ـــــ " بھئی ـــــ ہم تو کوئی اور ہی
کورس کروانا چاہ رہے تھے !" ـــــ اور تب ـــــ اس لمحہ ہمارے ہاں کی صدیوں پرانی قدامت
پرست لڑکی جو ہر آزاد سے آزاد خیال لڑکی کے وجود میں ہوتی ہے بڑی بُری طرح گھبرا گئی تھی۔

اور جس کی گھبراہٹ کی سُرخی یقیناً میرے چہرے پر بھی پھیل گئی تھی ـــــ میں نے ایک
نظر تم کو دیکھا ـــــ تم حسبِ عادت لاتعلق سے ـــــ سنجیدہ نظروں سے میری ہی طرف
دیکھ رہے تھے ـــــ اس دن ـــــ ہاں پہلی بار ـــــ پچھلے تین سالوں میں پہلی مرتبہ مجھے
نہ جانے کیوں تم پر اعتبار آ گیا تھا ـــــ تمہاری آنکھوں کی سنجیدہ سوچ نے مجھے بھی کچھ سمجھنے
پر مجبور کر دیا تھا ـــــ شاید یہ خطوط اسی لمحہ کا نتیجہ ہیں ـــــ یہ تعلق اسی دن کی سنجیدگی کا تحفہ
ہیں ـــــ لیکن ـــــ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بچھڑنے کا لمحہ تھا اسی وجہ سے مجھے تم پر
اعتبار آ گیا تھا ـــــ ویسے بھی بچھڑنے والے سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رہ جاتا ـــــ
پرسوں ریحان آیا تھا ـــــ یاد ہے وہ ہنس مکھ چلبلا سا لڑکا دو ڈھائی سال پہلے تم اس
سے ملے تھے شاید تمہیں یاد ہو ـــــ یہاں آجکل کولمبیا یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے ـــــ
جس وقت وہ پہنچا ہے اتفاق سے میں تمہارا ایک پرانا خط پڑھ رہی تھی ۔

" آپی ـــــ کس کا خط پڑھ رہی ہو ؟" ـــــ اس نے مجھ سے پوچھا تھا ۔

اور جب میں نے تمہارا بتایا تو چند لمحے سوچتا رہا پھر ایکدم بولا :

" اوہ ـــــ وہ شاعر صاحب ! ـــــ ارے تمہاری دوستی بھی کیسے کیسے
لوگوں سے ہے ـــــ اب ختم کرو یہ قصہ ! ـــــ تم نے زندگی کی کھلی شاہراہ پر
قدم رکھ دیا ہے ـــــ بس آگے کی طرف دیکھو ـــــ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا کوئی فائدہ

نہیں !" ___ اور میں حیرت سے اسے دیکھتی رہی ___ دو برسوں نے اسے کس قدر سمجھ دے دی تھی۔ عمر میں وہ مجھ سے پانچ برس چھوٹا ہے ___ اور عقل میں کسقدر بڑا لگ رہا ہے ___ مگر میں اس کی بات سن کر ہنس دی تھی۔

" تعلق اتنی آسانی سے نہیں توڑے جاسکتے !" ___ میں نے تمہارا خط ایک طرف رکھتے ہوتے کہا تھا۔

" ایسے تعلق بناؤ ہی مت جنہیں توڑنے کی ہمت نہ ہو !" ___ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

" اچھی بات ہے ___ چچا جان کو لکھ دوں گی کہ اب اپنے بیٹے سے ہاتھ دھولیں"۔ میں نے کہا۔ اور وہ زور سے ہنس پڑا تھا۔

" خونی ناطوں کی بات نہیں ___" وہ ہنستے ہوتے بولا۔

"میں دنیاوی تعلق کی بات کر رہا ہوں ___ مگر یہ خونی ناطے بھی دوری سے کمزور پڑ جاتے ہیں !" ___ وہ کہتا ہوا غسل خانے کی طرف چلا گیا ___ اور میں کافی دیر خاموش بیٹھی اس کے فلسفہ پر غور کرتی رہی۔

اس وقت تو کہیں گھومنے پھرنے گیا ہے ___ ابھی چند لمحوں میں آنے والا ہے آج اس نے فرمائش کی ہے کہ بہت سارے پاکستانی کھانے بنا دوں ___ کچھ کھائے گا، کچھ باندھ کرلے جائے گا ___

اچھا اجازت ___

شیری ___

اد کلاہاما ـــــ

عزیزہ!

محبت کے فلسفہ پر مبنی تمہارا شاہکار ابھی ابھی ملا ـــــ پڑھ کر میرے اندر کی وہی قدامت پرست لڑکی جو گہری نیند سو رہی تھی چونک اٹھی ـــــ لجا گئی ـــــ مگر پھر میرے تیز قہقہے نے اسے سہما دیا ـــــ تم نے لکھا ہے کہ میں تمہاری تمام دوست لڑکیوں میں وہ واحد لڑکی ہوں جس سے تم نے محبت کی! ـــــ اور یہ جملہ پڑھ کر پندرہ سولہ برس پہلے کا ایک نقشہ ذہن میں جگمگانے لگا ـــــ میں ان دنوں اسکول میں پڑھتی تھی ـــــ شاید نویں کلاس میں تھی ـــــ میرے گھر کے عین سامنے ایک بچوں کا پارک تھا، ہر شام وہاں چلی جاتی ـــــ ٹافیوں کا ایک تھیلا خرید لیتی اور جو بچہ اچھا لگتا اسے چند ٹافیاں دے دیتی ـــــ اور بس! ـــــ میں جب سے یہاں آئی ہوں ـــــ سینکڑوں مردوں، نوجوانوں اور لڑکوں سے مل چکی ہوں ـــــ ملتی رہتی ہوں ـــــ جن میں عیاش افراد بھی ہیں ـــــ شاید آوارہ بھی ہوں اور یقیناً شرفا بھی۔ مگر ان سب میں۔ میں نے جو قدر مشترک دیکھی وہ یہ کہ یہ تمام افراد ذہنی دیوالیہ پن کا شکار نہیں ہیں ـــ یہ جسے دوست کہتے ہیں ـــ اسے دوست ہی سمجھتے ہیں ـــــ جس سے محبت کرتے ہیں اس کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں ـــــ جس سے جسم کا تعلق قائم کرتے ہیں وہاں انہیں جسم کی لطافتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ـــــ جس سے روح کا بندھن باندھتے ہیں وہاں پر جسم ثانوی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ـــ اور یہ کہ عورت ان کے نزدیک ایک محترم ہستی ہے ـــــ یہ الگ بات ہے کہ مغرب کی عورت اپنی حدود و قیود توڑ چکی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کا مرد بھی تو ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہے ـــــ ہمارے ہاں کپڑوں میں لپٹی ایک عورت کو دیکھ کر مرد بے قابو ہو جاتے ہیں ـــــ اور یہاں ـــــ ہزاروں عورتیں بکنی پہنے ساحل سمندر پر پڑی رہتی ہیں مگر کوئی ان پر نگاہِ غلط انداز بھی نہیں ڈالتا ـــ گو مجھے عورت کی پامالیٔ حرمت پر دکھ بھی بہت ہوتا

ہے ـــــ مگر ایک عجیب طرح کی طمانیت کا احساس بھی ہوتا ہے ـــــ تم نے کس برتے پر اتنا بڑا دعویٰ کیا کہ تم کو مجھ سے محبت ہے ـــــ ہو سکتا ہے کہ یہ تمہارا ذاتی فعل ہو ـــــ مگر اس بات کا ضرور اقرار کرتی ہوں کہ تم کو میں نے پسند کیا ـــــ لیکن وہ محبت جو مرد اور عورت کو ایک حسین ان دیکھے بندھن میں باندھ دیتی ہے ـــــ وہ محبت مجھے تم سے کبھی نہ تھی ـــــ پسندیدگی اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے ـــــ پھر بھلا محبتیں اتنی جلدی ہو جاتی ہیں ؟ ـــــ یہ جذبہ تو بہت آہستہ آہستہ انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے ـــــ اور انسان کو علم بھی نہیں ہو پاتا ـــــ اس قدر نازک اور خوب صورت جذبے کو فقط محسوس ہی کیا جا سکتا ہے ـــــ اس کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی ـــــ اظہار کی حاجت نہیں ہوتی ـــــ تم کہو گے کہ دوری کی وجہ سے تم نے لفظوں کا سہارا لیا ـــــ لیکن ـــــ لیکن ـــــ جب میں وہاں تھی ـــــ تب بھی تو تمہارے الفاظ ہی تھے ـــــ تمہارا انداز ایسا ہی تھا ـــــ مگر ـــــ میرے دل میں کسی احساس، کسی جذبے نے کبھی سر نہ اٹھا ـــــ اور پھر تم خود ہی تو کہتے ہو کہ ہم اچھے دوست ہیں ـــــ یقین کرو ـــــ میں نے تم کو ہمیشہ ہی اپنا دوست سمجھا ـــــ پھر میں تمہاری وہ بات تا دمِ مرگ نہیں بھول سکتی ـــــ ایک تقریب میں تم نے ایک خوبصورت سی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا : ـــــ "اسے دیکھ رہی ہو ـــــ پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے ـــــ میرے آگے پیچھے پھرا کرتی تھی !" ـــــ اور عزیز میرے !ـــــ تم کو پتہ ہے ایک لمحہ کو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بھرے مجمع میں میں بے لباس ہو گئی ہوں ـــــ کیونکہ ـــــ بہت ممکن ہے کہ آنے والے کل کو تم یہی الفاظ میرے بارے میں کسی اور سے کہہ جاؤ ! ـــــ بہت ممکن تھا کہ میرا لگاؤ ـــــ میری پسند محبت میں بدل جاتی۔ اگر تم اس قدر جلدی نہ کرتے ـــــ تم کہتے ہو میرے خطوط نے تم کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے ـــــ مگر میں پوچھتی ہوں تمہارے بولے ہوئے جملے میرے

دل و جذبات کی دنیا زیر زبر نہ کر گئے ہوں گے ؟ میں ایک مضبوط دل و دماغ کی لڑکی ہوں اس لئے ہر بات کو ہنسی میں اڑاتی رہی ـــــ میرے اندر کی لڑکی کتنی بار ٹوٹی ـــــ کتنی بار بکھری ـــ اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ تمہیں بھی نہیں جو ـــــ میری محبت کے دعوے دار ہو!

شبری ـــــ

او کلا ہاما !

! !

چار ماہ قبل ـــــ یا اس سے بھی پہلے تمہارا نصیحت نامہ ملا تھا ـــــ وہ پلندہ میں نے دراز میں رکھ دیا تھا ـــــ آج کسی کام سے دراز کھولی تو اس پر نظر پڑ گئی ـــــ سوچا چلو جواب دے دوں ـــــ اور اب تو ویسے بھی جواب سوال کا سلسلہ ختم ہونے والا ہے ـــــ تم نے لکھا ہے کہ میرا خط سیاہی سے نہیں بلکہ زہر کے قطروں سے لکھا گیا ہے ـــــ افسوس کہ اس کا بھی تو تریاق تمہارے پاس نہیں ـــــ تم کہتے ہو کہ مغرب کی ہوا نے میرے خیالات کو مسموم کر دیا ہے ـــــ مگر ـــــ تم تو مشرق کی ہواؤں میں رہ رہے ہو ـــــ تم میں اختلاط کیوں ؟ ـــــ تم نے مذہب ، معاشرت ، تہذیب کے حوالوں سے بہت سی باتیں سمجھانے کی کوشش کی ہے ـــــ لیکن ـــــ تم خود فیصلہ کرو آج یہ سب چیزیں تم کو کیوں اہم لگ رہی ہیں ـــــ دو برس پہلے جب میں وہاں تھی تو ان ناموں کو سنا تک نہ تھا ـــ ! ـــــ تم نے لکھا ہے شوہر عورت کا مجازی خدا ہوتا ہے ۔ ضرور ہوتا ہو گا ـــــ مگر میں تو صرف ایک ہی خدا کے آگے سجدہ ریز ہو سکتی ہوں ـــــ آگے کا فلسفہ تو بالکل فضول اور بکواس ہے ـــــ تم کہتے ہو کہ میں ایک آئیڈیل لڑکی ہوں ـــــ ضرور ہوں گی ـــــ مگر یہ بھی تمہاری ذاتی رائے ہے اس میں میرا کیا قصور ؟ ـــــ ہاں تم نے یہاں آنے کو لکھا ہے ـــــ ضرور آؤ ـــــ اس وقت

تک میں اپنے گھر کی ہو چکی ہوں گی —— میرا ہونے والا شوہر ۳۹ سالہ امریکن نژاد پروفیسر ہے —— حیران نہ ہو —— یہ دنیا کے کسی مذہب پر یقین نہیں رکھتی ماسوا انسانیت کے —— پھر اس نے نہ چاہتوں کا رونا رویا نہ محبتوں کے دعوے کئے —— بس ایک سیدھی سادی سی بات کہی کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے —— اور بس ! —— مجھے کم سے کم اتنا تو یقین ہو گا کہ جو شخص مجھ سے صرف شادی کر رہا ہے وہ ہر لحاظ سے میرا ہی ہو گا —— ایک روز ہم دونوں محبت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے —— باتوں باتوں میں مَیں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا —— وہ بڑے غور سے میری باتیں سنتا رہا پھر ایکدم ہنس کر بولا : ——

" شیری میرے خیال میں تمہارا دوست ابھی امیچیور ہے !" —— دیکھا تم نے تمہارا ہم عمر یہ مردتم کو نابالغ ذہن کا لڑکا سمجھ رہا ہے —— ہے نا عجیب سی بات —— اور مجھے اپنے پر حیرت ہو رہی ہے کہ تم کو کس طرح میں نے ایک سمجھ دار آدمی سمجھ لیا تھا —— بہر کیف —— اگلے ماہ میری شادی ہے —— مجھے یقین ہے میری زندگی بے حد اچھی —— بہت پر سکون گزرے گی —— گو میری خواہش یہی تھی کہ اچھی چیز کا حصول اگر اپنوں میں رہ کر ہوتا تو یہ خوشی دوگنی ہو جاتی —— مگر چونکہ ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا —— اس لئے مجبوری ہے —— مجھے یقین ہے کہ یہ اچانک خبر اگر تمہیں حیران کرے گی تو —— خوشی بھی دے گی —— میں تمہاری دوست ہوں نا —— یقیناً تمہاری نیک خواہشات میرے ساتھ ہوں گی ! ——

الوداع —— شیری ——

کراچی ۱۹۷۹ء

لمحے کی دہلیز

میں ابھی اخباری تراشوں کی فائل دیکھ رہی رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور سلمان حسبِ عادت چنگھاڑتا ہوا داخل ہوا۔

" شکر ہے کہ آج تم موجود ہو ـــــ ورنہ تو میں سمجھ رہا تھا کہ نکل گئی ہو گی کہیں مہم پر" ـــــ اس نے کہا اور مڑ کر کسی سے بولا :

" اندر آجاؤ یار !" ـــــ اس کی آواز کے ساتھ ہی ایک لمبا تڑنگا وجیہہ مرد کمرے میں داخل ہوا۔

" عنبر ـــ یہ میرا دوست ہے انوار ـــــ اور انوار یہ ہے میری کلاس فیلو عنبر اس ادارے کی معروف پی ۔ آر ۔ او" ـــــ سلمان تعارف کی رسم کے ساتھ ہی بمعہ اپنے دوست کے ایک طرف پڑے صوفے پر براجمان ہو گیا۔

" سلمان آپ کی بہت تعریف کرتا ہے !" ـــ ہلکے رنگوں کی بڑی بڑی آنکھوں والے تیکھے نقوش کے انوار نے کہا۔

" ڈرتا ہو گا مجھ سے !" ـــــ میں نے تراشوں کی فائل ایک طرف رکھتے ہوئے ہلکے سے ہنس کر کہا۔

" ہاں تم ہی تو رہ گئی ہو ڈرنے کے لئے" ـــــ وہ اٹھ کر میری میز کے قریب آگیا۔

"ابے ! ایک دن میں اتنی خبریں ؟" ـــــ اس نے فائل کھولتے ہوئے حیرت سے کہا ۔

"ایک ہفتہ کی کہو" ـــ میں بولی ۔

"پھر بھی یار ـــ ایک ہفتہ میں اچھا خاصا انبار جمع کر لیا ہے !" ـــــ اس کے لہجہ میں اب بھی حیرت تھی ۔

"اپنا تو کام ہی یہی ہے !" ـــ میں ہنسی ۔

"اچھا انوار صاحب چائے پیئں گے یا ٹھنڈا ؟" ـــــ میں مہمان کی طرف مڑی ۔

"یہ کیا جانے چائے پینا ـــــ اس کے لئے تو لسّی منگواؤ یا پھر اگر ڈیڑھ گز کا گلاس مل جائے تو اس میں تازہ دودھ !" ـــ سلمان دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر بولا ۔

"اچھا ـــ خیر سے چھلنی بھی بولنے لگی ـــ یاد ہے شروع شروع میں جب تم سیالکوٹ سے آئے تھے تو کیا حالت تھی تمہاری ؟ ؟" ـــ میں نے سلمان سے کہا ۔

"خیر وہ تو پرانی بات ہو گئی ـــ ویسے واقعی اس کراچی نے تو اپنے کو ذائقہ بلائنڈ کر دیا ہے ـــ نہ دودھ اچھا لگتا ہے نہ لسّی !" ـــ سلمان منہ بنا کر بولا اور میں اس کی "ذائقہ بلائنڈ" کی ترکیب پر زور سے ہنس دی ۔

"ہاں میں نے انوار کا مکمل تعارف تو تم سے کرایا نہیں" ـــ یہ اور میں لاہور میں ایک کالج میں کچھ عرصہ ساتھ پڑھے تھے ـــ یہ تو پھر انجینئرنگ کی طرف چل دیا اور ہم کراچی ـــــ اب یہاں ایک تعمیراتی کمپنی میں ملازم ہو کر چند ماہ پہلے آیا ہے ـــ گھر اس کا بہاولپور میں ہے اور . . . .

"اوہ ! تو آپ ریاستی ہیں !" ـــ میں نے سلمان کی بات کاٹ کر انوار سے پوچھا۔

"ہاں جی ـــ کہہ سکتی ہیں !" ـــ اس کی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے چہرے کا روپ دمکنے لگا۔

میں نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی سے چائے کا کہہ دیا۔

"آپ دونوں نے جرنلزم میں ماسٹرز کیا ہے مگر آپ یہاں ہیں اور ـــ سلمان انشورنس کمپنی میں ـــ اخبارات میں کام کیوں نہیں کرتے ؟" ـــ اس نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

"بات دراصل یہ ہے انوار صاحب کہ تعلیم کے دروازے تو ہر خاص و عام پر کھول دیئے گئے ہیں مگر ادارے اتنی تعداد میں نہیں بنے ـــ اور اس طرح ہم JOB LESS ہو کر رہ گئے ہیں !" ـــ میں نے کہا ـــ اور دونوں ہی ہنس پڑے۔

"یہ اچھی ترکیب ہے جاب لیس والی" ـــ سلمان بولا ـــ پھر ہم تینوں کافی دیر تک موجودہ حالات پر گفتگو کرتے رہے۔

پھر انوار اکثر آتا ـــ کبھی سلمان کے ساتھ اور کبھی تنہا ـــ اپنے سیدھے سادے انداز میں بڑی گہری باتیں کرتا ـــ مجھے اس کے بات کرنے کا انداز بہت اچھا لگتا تھا ـــ ایک روز میں دفتر سے نکل رہی تھی کہ وہ آ گیا۔

"کہاں جا رہی ہیں ؟" ـــ اس نے خوش خلقی سے پوچھا۔

"چھٹی کے بعد کہاں جاتے ہیں ؟" ـــ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں ـــ میں تو اکثر آپ کے پاس ہی آجاتا ہوں !" ـــ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"مگر میں گھر جاتی ہوں !" ـــ میں نے اسی لہجہ میں کہا۔

"اوہ خوش قسمت ہیں آپ ـــ چلئے میں پہنچا دوں !" ـــ اس نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"شکریہ ـــــ ابھی شہر میں ٹرانسپورٹ کا کال نہیں پڑا ہے !" ـــــ میرا لہجہ اب
بھی وہی تھا۔

"سمجھ گیا ـــــ شاید آپ اپنا گھر دکھانا نہیں چاہتیں !" ـــــ وہ ہنسا۔

"نہیں ـــــ ایسی بات نہیں، خواہ مخواہ آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہ رہی !"
میں نے اس کے ساتھ دفتر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ ـــــ خصوصاً کراچی کے ـــــ تکلف بہت کرتے ہیں !" ـــــ اس
نے کہا ـــــ اب ہم فٹ پاتھ پر آ چکے تھے ـــــ کچھ دیر وہ کراچی کے موسم کے بارے میں گفتگو
کرتا رہا ـــــ میں نے ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔

"چلیے میں پہنچا دوں آپ کو ؟" ـــــ میں نے ہلکے سے ہنس کر کہا ـــــ اور وہ
زور سے ہنس دیا۔

"ویسے میں کسی کال کا انتظار کرنے کا عادی نہیں ـــــ خدا حافظ !" ـــــ میں ٹیکسی
میں بیٹھ گئی تو ایک دم اس نے کہا اور میں بس اسے دیکھ کر رہ گئی !

اس روز سلمان گھر پر آیا ہوا تھا ـــــ

"کیا کہہ دیا تم نے انوار سے جو یہاں آنے پر تیار ہی نہیں ہوا ؟" ـــــ چائے پیتے
ہوئے اس نے پوچھا۔

"تمہارا کام ہی مجھے بدنام کرنا ہے ـــــ بھلا میں کیا کہوں گی ؟ ـــــ اور کیوں ؟"
میں نے ہنس کر کہا۔

"خیر ـــــ تم کو میں اچھی طرح جانتا ہوں ـــــ اسی وجہ سے پوچھ بھی رہا
ہوں !" ـــــ سلمان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا چلو بیکار کی باتیں مت کرو ـــــ میں نے کچھ نہیں کہا !" ـــــ میں نے اسے
یقین دلانے کی کوشش کی۔

"بکواس ہے —— نری بکواس —— وہ کچھ دن پہلے تمہارے دفتر نہیں گیا تھا؟؟"
سلمان نے پوچھا۔
"ہاں آیا تھا —— بلکہ اکثر آتا ہے ——!" میں نے اقرار کیا۔
"بس! —— سمجھ گیا آپ نے کوئی افلاطونی قسم کا ڈائیلاگ بول دیا ہوگا!" ——
وہ منہ بنا کر بولا اور میں زور سے ہنس دی، پھر اسے پورا واقعہ سنا دیا۔
"یار ایسے تو مت کیا کرو —— بڑا احساس لڑکا ہے —— پھر ہر لڑکا سلمان تو نہیں ہوتا
جو تمہاری ہر کڑوی کسیلی کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی جائے!" —— سلمان بولا۔
"خیر —— تم تو دوست ہو، کلاس فیلو ہو پھر چار پانچ سال سے جانتے ہو ——
اس کا کیا تعلق؟" —— میں نے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے کہا۔
"ہوں —— ہو سکتا ہے کوئی تعلق بنانا چاہ رہا ہو —— بھئی ایسے تو کوئی کسی کے
پاس آتا جاتا نہیں!" —— سلمان ہنس کر بولا۔
"نادان ہے —— اگر اس نے ایسا سوچا بھی ہے!" —— میں نے کہا۔
"تم —— اپنے آپ کو بڑا عقل مند سمجھتی ہو؟" —— سلمان کو غصہ آگیا تھا۔
"دھیرج عزیز دوست —— لے آنا اسے کسی دن تمہارے سامنے معافی مانگ
لوں گی!" —— میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا —— اور سلمان مطمئن ہو گیا۔
دوسرے دن صبح میں دفتر آکر بیٹھی ہی تھی کہ اطلاع ملی کہ ڈائریکٹر صاحب بلا رہے
ہیں —— "جی —— آپ نے بلایا تھا!" —— میں نے ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں
داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں —— عنبر —— ایک غیر ملکی وفد گیارہ کو پاکستان آ رہا ہے —— اور چودہ کو
وہ لوگ ہمارے ادارے کا دورہ کریں گے" —— انہوں نے بتایا۔
"اوہ —— یہ اچانک ہی!" —— میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اچانک ہی سمجھو ـــ ابھی کچھ دیر پہلے منسٹر صاحب کے پی۔ اے نے فون کرکے اطلاع دی ہے۔ منسٹر صاحب کی خواہش ہے کہ وفد کو تفصیلی طور پر یہ ادارہ دکھایا جائے!" ـــ انہوں نے تفصیل بتائی۔

"اچھا! ـــ مگر سرکاری طور پر تو کوئی اطلاع نہیں تھی!" ـــ میں نے کہا۔

"ہاں ـــ شاید سرکاری طور پر پہلے سے پروگرام نہ رہا ہو۔!" ان کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

"آپ فکر نہ کیجئے سب کچھ ہو جائے گا!" میں نے تسلی دی۔

"ہوں ـــ ہاں آٹھ افراد تو وفد کے ہوں گے ـــ یہ لو لسٹ ـــ اور دس افراد ہمارے ادارے کے، چھ سات لوگ باہر کے ہوں گے ـــ ان سب کا لنچ بھی ہماری طرف سے ہوگا ـــ کسی اچھے ہوٹل میں بکنگ کرا لینا ـــ" وہ جلدی جلدی بول کر خاموش ہو گئے۔

"ٹھیک ہے ـــ سب ہو جائے گا!" ـــ میں نے انہیں اطمینان دلایا۔

"اور ہاں سنو ـــ!" ـــ میں کمرے سے نکلنے لگی تو انہوں نے پھر پکارا۔

"جی ـــ!" ـــ میں مڑی۔

"وہ میں نے انتظامیہ کو کہہ دیا ہے ـــ تمہیں گاڑی کی کوئی مشکل نہیں ہوگی!" انہوں نے مزید کہا۔

"جی اچھا!" ـــ میں نے کہا اور باہر نکل گئی۔ پھر میں انتظامات میں مصروف ہو گئی۔ ہمارے ادارے میں غیر ملکی وفد کی آمد کی تشہیر میں اخبارات میں بیٹھے میرے دوستوں نے بہت مدد کی ـــ اُن لوگوں کی تصاویر، خبریں، وفد کے سربراہ کے تعریفی کلمات جو انہوں نے ادارے اور اس سے وابستہ کارکنان کے بارے میں کہے تھے۔ بیشتر اخبارات نے پہلے صفحہ پر شائع کئے تھے۔

"میڈم ـــــ آپ کو چیئرمین صاحب بلا رہے ہیں !" ـــــ میں فون پر اپنے اخباری ساتھیوں کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ چپڑاسی نے آکر اطلاع دی۔

"آؤ ـــ آؤ عنبر !ـــــ" میں جیسے ہی چیئرمین صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی۔ انہوں نے گرم جوشی سے کہا۔

"ویل ڈن عنبر !ـــــ یہ دیکھو منسٹر صاحب کا توصیفی خط !" ـــــ انہوں نے خط میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ـــــ خوشی سے ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"سر یہ تو ہم سب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے !" ـــــ میں نے خط پڑھ کر انہیں واپس کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں عنبر ـــــ یہ سب تمہاری محنت ہے ـــــ تم نے اتنی اچھی پبلسٹی کرائی ہے کہ سب ہی لوگ بے حد خوش ہیں !" ـــــ انہوں نے اسی لہجہ میں کہا۔

"سر اس عزت افزائی کا بے حد شکریہ ـــ مگر یہ میرے فرائض میں شامل ہے!" میرے لہجے میں کچھ انکسار اتر آیا تھا۔

"ٹھیک ہے ـــــ اب میں بھی ایک فرض پورا کروں گا ـــــ تم کو ادارے کی طرف سے کار لون دلوا دوں ـــــ جس کی انتہائی معمولی اقساط تمہاری تنخواہ سے کٹتی رہیں گی !" ـــــ انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"کہاں چلی گئی تھیں ؟ ـــــ آدھے گھنٹہ سے انتظار کر رہا ہوں !" ـــ جب میں کمرے میں پہنچی تو سلمان دھاڑا۔

"کب آئے ؟" ـــــ میں نے اپنی کرسی کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

"بتایا تو ہے آدھے گھنٹہ سے ہم دونوں انتظار کر رہے ہیں !" ـــــ سلمان نے اسی لہجہ میں کہا۔

"اوہ ! ـــــ انوار صاحب ـــ بہت دنوں بعد آپ آئے ؟" ـــــ میں نے

خوش دلی سے کہا اور وہ مسکرا دیا۔

"اسی ایک ہفتہ میں آج تیسری بار ہم لوگ آئے ہیں ــــ اور بیگم صاحبہ کا پتہ ہی نہیں چل رہا!" ــــ سلمان منہ بنا کر بولا۔

"ہاں ــــ وہ ایک غیر ملکی وفد آیا ہوا تھا۔ اسی سلسلہ میں مصروف تھی" ــــ میں نے کہا اور پھر تفصیل سلمان کے گوش گزار کر دی۔

"ہاں یار ــــ لڑکی ہونے کا یہی تو فائدہ ہے ــــ سالے اخبار والے خبریں لگا دیتے ہیں اور چیئرمین کارٹون دلوا دیتا ہے!" ــــ سلمان ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"اچھا ــــ چائے پئیں گے آپ لوگ؟" ــــ میں نے انوار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں ــــ آج تو آپ دونوں کی میری طرف سے دعوت ہے، دوپہر کے کھانے کی!" وہ بولا۔

"کس خوشی میں؟؟" ــــ میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"اترا رہی ہے اور کچھ نہیں ــــ چلو اٹھو!" ــــ سلمان نے ڈانٹا۔

"بھئی سلمان مجھے بہت سے کام ہیں!" ــــ میں نے بہانہ بنانا چاہا۔

"بکواس مت کرو ــــ بس سیدھی سیدھی ہمارے ساتھ چلی چلو!" ــــ سلمان نے کہا اور میں خاموش ہو گئی۔

"اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی ــــ چلی چلئے!" ــــ انوار اپنے مخصوص نرم لہجہ میں بولا۔

"ابھی سے؟؟" ــــ ابھی تو فقط بارہ بجے ہیں ــــ اور مجھے یہ فائل مکمل کر کے چیئرمین صاحب کو بھجوانا ہے!" ــــ میں نے گویا حامی بھر لی تھی، اس طرح مجھے چند

ہفتے پہلے کی انوار سے بدتمیزی کی تلافی کا موقع بھی مل گیا تھا۔

"ٹھیک ہے ـــ تم یہ مکمل کرلو ـــ ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں !" ـــ سلمان اٹھتے ہوئے بولا۔

"ڈھائی بجے تک آنا !" ـــ میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے ـــ ہم ٹھیک ڈھائی بجے پہنچ جائیں گے !" ـــ انوار مسکرا کر بولا اور دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

ہم کھانے سے فارغ ہوتے تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔

"اچھا یار ـــ میں تو چلا ـــ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے !" ـــ سلمان کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"ارے نہیں ـــ بس سب ہی چلتے ہیں !" ـــ میں نے گھڑی دیکھتے ہوتے کہا۔

"چلیے ـــ میں آپ دونوں کو ڈراپ کردوں گا !" ـــ انوار نے اپنی خدمات پیش کیں۔

"نہیں ـــ میں چلی جاؤں گی !" ـــ میں اٹھتے ہوئے بولی۔

"ارے نہیں ـــ آپ بھی کمال کرتی ہیں ـــ آج تو یہ اعزاز مجھے بخش دیجیے !" انوار نے مسکرا کر کہا ـــ اور میں خاموش ہوگئی۔

"پونے چھ تو آپ نے گاڑی ہی میں بجا دیئے !" ـــ سلمان کو اس کے گھر چھوڑ کر جب ہم واپس آرہے تھے تو گھڑی دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"اصل میں عنبر ـــ مارے خوشی کے گاڑی کے قدم نہیں اٹھ رہے ہیں !" ـــ وہ سامنے دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا۔ اور میں خاموش رہی۔

"کیوں عنبر کہیں چائے نہ پی لی جائے ؟" ـــ چند لمحوں بعد اس نے پوچھا۔

"نہیں ـــ میں گھر جاؤں گی !" ـــ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"چھوڑ آؤں گا ـــ کچھ دیر اچھا ساتھ رہے تو برا نہیں !" ـــ اس نے گاڑی

موڑتے ہوتے کہا — اور میں جھنجھلاہٹ میں باہر دیکھنے لگی —— سردیوں کی شام اندھیرا تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ سڑکوں کی روشنیاں جل اٹھی تھیں۔

"ارے —— یہ گاڑی کیوں رک گئی ؟" —— جھٹکے سے گاڑی رکی تو میں چونک اٹھی۔

"پرانی گاڑی ہے —— کچھ گڑبڑ ہوگئی ہو گی !" —— اس نے انجن بند کرتے ہوئے کہا اور اُتر گیا —— تقریباً پندرہ منٹ تک وہ بونٹ کھولے گاڑی ٹھیک کرتا رہا۔

"چلئے —— اب ٹھیک ہو گئی ہے !" —— وہ واپس آکر بیٹھتے ہوتے بولا۔ ابھی چند فرلانگ ہی گاڑی چلی تھی کہ گھرر گھرر کرکے پھر رک گئی۔

"لیجئے —— آپ کی چہیتی پھر کھڑی ہو گئی !" —— میں نے منہ بنا کر کہا۔

"یہ چہیتے بھی عجیب فطرت لے کر آتے ہیں —— جب تک ان کے ساتھ تھوڑی سی زبردستی نہ کی جائے قابو میں ہی نہیں آتے !" —— وہ ذومعنی جملہ کہتا ہوا پھر گاڑی سے اتر گیا۔

"آپ نے عنبر کبھی کسی کو چاہا ہے ؟" —— اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یعنی ؟ ؟" —— میں نے لاتعلقی سے پوچھا۔

"یعنی کسی مرد کو !" —— اس نے کہا۔

"نہیں !" —— میں نے کہا اور خاموش ہوگئی —— گاڑی نے تیزی سے موڑ کاٹا اور ایک دم رُک گئی۔

"ارے اب کیا —— اور اس کے لبوں نے میرا جملہ جذب کرلیا۔ نہ جانے کتنی دیر میں بے بسی سے اس کی باہنوں میں جکڑی رہی۔

"یہ کیا حرکت کی تھی ؟ ؟" —— طویل بوسے کے بعد جب اس نے علیحدہ کیا تو میں غصہ سے چیخ پڑی۔

"کچھ نہیں —— آپ نے کسی مرد کو نہیں چاہا ہے —— مگر میں نے تو کسی کو

چاہا ہے ـــــ وہی بتا رہا تھا !" ـــــ اس نے مطمئن لہجہ میں کہا ـــــ غصہ نے میری زبان بند کی ہوئی تھی ـــــ اس نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"شرما رہی ہو ؟ ـــــ وہ ایک دم ہی بے تکلف ہو گیا تھا ـــــ مگر میں نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"دیکھو عنبر ـــــ میں اپنے رات والے فعل پر بالکل شرمندہ نہیں ـــــ میں ـــــ واقعی تم کو چاہتا ہوں ! ـــــ تمہارے حصول کا خواہش مند ہوں ـــــ اور اسی شدید خواہش کا وہ ردِّ عمل تھا ! ـــــ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنی جرأت میں کیسے کر سکتا تھا ؟" ـــــ وہ میرے دفتر میں میرے مقابل بیٹھا کہہ رہا تھا۔ اور میں بس اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئی ـــــ وہ میری نظروں میں کوئی مقام پانے سے پہلے ہی گر چکا تھا۔

" جو ہو گیا ـــــ اسے بھول جایئے !" ـــــ میں نے آہستہ سے کہا ـــــ اور وہ کھل اٹھا۔

"مجھے معلوم تھا ـــــ تم میری چاہت قبول کر لوگی ـــــ مجھے اپنے پر اعتماد تھا ـــــ چند ہفتوں میں میرے اماں ابا آ رہے ہیں ـــــ تمہیں اپنی بہو بنانے ـــــ تمہیں نہیں معلوم میں نے ان لوگوں کو کس مشکل سے راضی کیا ہے !" ـــــ اس نے کہا۔

" ہونہہ ـــــ بہو بنانے !" ـــــ ایک طنزیہ مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی۔

" اوکے ـــــ اب چلتا ہوں ـــــ امّاں ابا کے آنے پر ہی ملاقات ہوگی !" ـــــ میں نے اس کے لہجہ میں خوش فہمی کو بولتے سنا۔

" عنبر ـــــ آخر کیا بُرائی ہے انوار میں ـــــ اتنا خوبصورت ، پڑھا لکھا اور شریف انسان ہے !" ـــــ میری بھابی میرے انکار پر سخت چراغ پا تھیں۔

" ہونہہ شریف انسان ! ـــــ آئندہ نہ میں انوار کا نام سنوں اور نہ اس کی تعریفیں !" میں نے تلخی سے کہا۔

" ممی ڈیڈی کو تو وہ لوگ بہت پسند آئے ۔ کس قدر نیک اور سیدھے سادے لوگ

لوگ ہیں اور خصوصاً انوار۔۔۔۔۔۔
"بھابی ___ ممی ڈیڈی اپنی پسند کا جسم میرے لئے کیوں خریدنا چاہ رہے ہیں؟! بس مجھے نہیں پسند آپ انکار کر دیجئے!" ___ میں نے تیز لہجہ میں کہا اور پیر پٹختی کمرے سے نکل گئی۔

"بھئی شباہت ___ تمہاری بیٹی تو بہت ذہین، بہت میچیور اور بہت AMBITIOUS ہے!" ہم سب کھانے کے بعد گفتگو کر رہے تھے کہ ڈیڈی کے ایک دیرینہ دوست اظفر حسین نے جو ایک طویل عرصہ بعد دیارِ غیر سے وطن لوٹے تھے، ستائش بھرے لہجے میں کہا۔

"یہی چیزیں لڑکیوں کی تباہی کا سبب بنتی ہیں" ___ ممی کو ان کی تعریف پسند نہیں آئی تھی منہ بنا کر بولیں ___ اور میں ڈیڈی اور اظفر حسین تینوں ہی اس ریمارک پر ہنس پڑے۔
"اپنے گھر والوں کو بھی لے آتے تو اچھا تھا!" ___ ممی کے لہجہ میں کرید تھی۔
اظفر حسین ایک لمحہ کو خاموش سے ہو گئے۔
"بات یہ ہے مسز شباہت ___ پچھلے بائیس برسوں سے خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزار رہا ہوں ___ بس اکیلا ہی ہوں!" ___ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے کہا۔
"اچھا!؟ ___ آپ نے شادی نہیں کی؟" ___ ممی نے حیرت سے پوچھا۔
"کی تھی ___ مگر بس چند سال قائم رہی پھر طلاق ہو گئی! ___ اس کے بعد شادی کا سوچا بھی نہیں!" ___ انہوں نے بتایا۔
"کسی غیر ملکی لڑکی سے کی تھی؟" ___ ممی نے افسوس بھرے لہجہ میں پوچھا۔
"ہاں غیر ملکی ہی سمجھئے ___ اس طرح کہ اس کے والدین پاکستان کو خیرباد کہہ چکے تھے!" انہوں نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔
"اوہ چھوڑیئے بھی یہ تذکرہ ___ کوئی اور بات کیجئے!" ___ اظفر حسین

کے چہرے کا دکھ مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور میں بول اٹھی ـــــ ممی ایک تیز نظر مجھ پر ڈال کر رہ گئیں ـــــ پھر وہ اکثر ہمارے گھر آتے ـــــ ڈیڈی نہ بھی ہوتے تو بھی میں ان کو پوری پوری کمپنی دیتی ـــــ بھابی، ممی اور میری بہن ان تینوں کو اظفر حسین قطعی پسند نہ تھے مگر ڈیڈی کے دوست تھے، اس وجہ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں۔

"کیا سوچ کر اظفر حسین نے اتنی بڑی بات کی ـــــ اولاد برابر لڑکی کو بیوی بنانے کا سوچا ہی کیسے؟ ـــــ اور آپ کو بھی شرم نہ آئی ـــــ کیسے مزے سے بیٹی کو بھینٹ چڑھانے کا کہہ رہے ہیں!" ـــــ ایک روز دفتر سے آئی تو لاؤنج میں ممی کی تیز آواز سن کر رک گئی۔

"مگر بیگم ـــــ تم عنبر سے تو پوچھ لو ـــــ آخر اظفر یہاں آتا رہا ہے ـــــ ہوسکتا ہے عنبر کی بھی یہی خواہش ہو!" ـــــ ڈیڈی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اسے کیا تمیز اپنے برے بھلے کی ـــــ مجھے تو آپ پر حیرت ہے!" ممی دہاڑیں۔

"مگر..... ڈیڈی نے کچھ کہنے کی کوشش کی اور ممی نے ان کی بات کاٹ دی۔

"اگر مگر کچھ نہیں ـــــ لو اور سنو ـــــ غضب خدا کا نہ اپنی عمر دیکھتے ہیں نہ عنبر کی ـــــ بس آپ اپنے چہیتے سے کہہ دیجیے آئندہ اس گھر میں قدم نہ رکھے!" ـــــ ممی نے غصہ سے کہا ـــــ

"کیا ہوا ممی؟" ـــــ میں لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں بیٹا ـــــ جاؤ منہ ہاتھ دھو لو ابھی دفتر سے آرہی ہو!" ـــــ ممی نے بمشکل اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی کا معاملہ ہے اور آپ مجھ سے ہی چھپا رہی ہیں ـــــ ممی ـــــ میں نے سب کچھ سن لیا ہے ـــــ اور ڈیڈی ـــــ مجھے اظفر حسین کی بات قبول ہے" ـــــ یہ کہہ کر میں بغیر ان لوگوں کا ردِعمل دیکھے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"آپی لگتا ہے تمہارا دماغ واقعی خراب ہو چکا ہے —— کچھ تو سوچا ہوتا —— اور پھر اظفر حسین صاحب تم کو دیں گے کیا؟ —— بے جذبہ سرد ہونٹوں کا زہر، ٹھنڈے وجود کا کرب، تنہائی کا عذاب اور . . . . . ."

"میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اظفر حسین ہی سے شادی کروں گی اور بس!" —— میں نے تنک کر کہا۔ میرے اقرار پر سارے گھر میں جیسے طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس وقت میں اپنی بھابی اور چھوٹی بہن کے نرغے میں تھی۔ دونوں دلائل سے مجھے قائل کرنے کی کوشش میں لگی تھیں ——

"عنبر —— یہ بھی تو سوچو کہ اظفر حسین صاحب ڈیڈی کی عمر کے ہیں —— اور یہ تمہارا وقتی فیصلہ ہے —— ساری زندگی پچھتاوے کی آگ میں جلوگی!" —— بھابی نے سمجھانا چاہا۔

"ایک تو نہیں معلوم کہ آپ لوگ اس قدر ایج کانشس کیوں ہیں؟ —— ایک آدمی مجھے ہر لحاظ سے مناسب اور بہتر لگا، اب اس سے کیا کہ اس کی عمر زیادہ ہے —— اور ایسی کوئی خاص عمر بھی نہیں" —— میں نے بھابی سے کہا۔

"لیکن عنبر . . . . . ."

"لیکن ویکن کچھ نہیں —— زندگی مجھے گزارنا ہے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے!" —— میں نے قطعی لہجہ میں کہا۔

"بیٹا اسی لئے تو کہہ رہی ہوں ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لو —— تم ابھی پوری ستائیس کی نہیں ہوئی ہو اور اظفر انچاس برس کے ہیں —— میری بچی! —— عمروں کا اتنا طویل فاصلہ تیری جوانی کیسے طے کرے گی!" —— ممی جو ایک طرف خاموش بیٹھی تھیں گلوگیر آواز میں بولیں۔

"ممی میرے نزدیک شادی کے لئے صرف دو چیزیں اہم ہیں —— مرد کی میچورٹی اور اس کا STABLISH ہونا اور بس!" —— میں نے دلیل دی۔

" بیٹا ــــ شادی کے لئے یہی دو چیزیں کافی نہیں ہیں ــــ یہ ثانوی چیزیں ہیں۔ شادی کے لئے کئی ایک بہت اہم باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے مرد اور عورت دونوں کے لئے !" ــــ ممی نے معنی خیز لہجہ میں کہا۔

" ٹھیک ہے ممی اگر آپ سب نہیں چاہتے تو انکار کر دیجئے۔ مگر پھر کبھی کوئی مجھ سے شادی کا نہ کہے ــــ میں نے آہستہ سے کہا اور اُٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

بیس برس یوں گزر گئے۔ جیسے ہوا کا خوشگوار جھونکا۔ شہرت، دولت شوہر کی بے پناہ چاہت ــــ سب ہی کچھ تو میرے پاس تھا ــــ اور پھر میں نے ایک میوزک اسکول کھول لیا۔ جس کی دیکھ بھال میں خود ہی کرتی تھی ــــ اس روز میں ذرا جلدی اسکول چلی گئی کیونکہ ایک غیر ملکی فنکارہ کو آنا تھا۔

" بھئی عنبر ــــ ایک سفارش ہے !" ــــ اظفر میرے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے ــــ

" غور کیا جاسکتا ہے !" ــــ میں نے مسکرا کر کہا۔

" تمہاری نرتکی کب آرہی ہے ؟" ــــ انہوں نے پوچھا۔

" ہوں ــــ جبھی اس قدر بنے سجے آپ یہاں موجود ہیں !" ــــ میں نے ہنس کر کہا۔

" ارے نہیں بھئی ــــ بھلا ہماری نرتکی کے سامنے کسی کی کیا حقیقت ؟"

انہوں نے پیار سے میری ناک انگلیوں میں پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے بغور ان کو دیکھا بیس برسوں کا کوئی نشان اس شخص کے بشرے پر نہیں تھا ــــ زندہ باد دولت اور بے فکری ــــ !

" کیا بات ہے کسی سوچ میں پڑ گئیں ؟" ــــ ان کی آواز سے میں چونک پڑی۔

" ہاں ــــ وہ آپ سفارش کی بات کر رہے تھے ؟" ــــ میں نے پوچھا۔

" ہاں ــــ میرے ایک جاننے والے ہیں ــــ ان کی بچی کلاسیکل رقص سیکھنا

"اس وقت ہم معاشی طور پر آزاد تھے ـــــ کوئی فکر نہ تھی ـــــ وہ تڑپ اب کہیں جا دبی ہے ـــــ جو زمین صرف ہماری پہچان بن جاتی ہے، ہمیں شناخت دیتی ہے ـــــ مگر ہمیں قبولیت نہیں بخشتی ـــــ جہاں ہمارے پیٹ کا ایندھن دھکتا رہتا ہو ـــــ وہ کسی ناطے سے ہمارا علاقہ ہوا کسی رشتے سے ہماری زمین ہوئی ـــــ ہم اسے کیسے اپنا کہہ سکتے ہیں ؟ ـــــ اور میرا دماغ جیسے گھومنے لگا ـــــ" جب پیٹ بھرا ہو ـــــ جیب میں سکّے ہوں تو پرائے بھی اپنے بن جاتے ہیں ـــــ اور یہ سب نہ ہو تو زمین بھی اپنی نہیں رہتی ! " زرخان اٹھتے ہوئے بولا ۔

" آپ کا فرسٹریشن ویسا ہی تھا ـــــ جیسے ہماری تڑپ ـــــ آپ ایک کامران انسان ہیں ۔ آپ کے پاس اس وقت وہ سب چیزیں ہیں جو کسی بھی انسان کا افتخار ہے ـــــ یہ معاذ اللہ آپ کو اپنا کہتا ہے ـــــ یہ شہر آپ کو اپنی شناخت جانتا ہے ـــــ یہاں کے دفاتر کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں ـــــ اب بتایئے بے وطن ہم ہیں یا آپ ؟ ؟" ـــــ ڈوگر کے جلتے ہوئے جملے نے جہاں مجھے ایک لمحہ میں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا ـــــ وہیں بے وطنی کا شدید احساس، بے زمینی کا کرب ایک بار پھر مجھ پر چھا گیا ـــــ لیکن اس بار یہ بے وطنی اپنی نہیں تھی ـــــ اس بار بے وطنی کے قافلے کے مسافر ڈوگر اور زرخان تھے !!

۱۹۸۵ء اسلام آباد

قانونِ قدرت

وہ کسی طور شادی پر راضی نہ ہوتی تھی ——— وہ بھی جانے کیوں شادی کے سخت خلاف تھا۔ تب ایک جگہ ایک تقریب میں دونوں کی ملاقات ہوئی —— یہ ملاقات چند مہینوں میں دوستی میں بدل گئی ——— اس کے ماں باپ کو امید بندھ گئی کہ شاید ان کی بیٹی اب شادی کر لے ——— ان کی دوستی کو تین برس ہو چکے تھے —— اور وہ صرف دوست ہی تھے —— اس کے ماں باپ خاندان اور دنیا والوں کی باتوں سے عاجز آ چکے تھے —— تب ایک دن اس کی ماں بلک پڑی —— باپ کی حالت پر دہل کر رہ گئی۔

"کیا میں اپنے ماں باپ کو کوئی سکھ نہیں دے سکتی؟"—— یہی سب سوچ کر اس نے اپنے دوست کو ساری بات بتا دی۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے ——— اور میں بھی اسی عذاب سے گزر رہا ہوں —— مگر...... مگر......"

"ہاں! ہاں کہو!"—— اس نے سہارا دیا۔

"بات یہ ہے...... کہ...... کہ...... میری نفسیات...... یعنی کہ...... کچھ عجیب سی ہے...... مقصد یہ ہے کہ...... کہ...... میں اپنے ہم جنس سے ہی مطمئن رہ سکتا ہوں!"—— اس نے گردن جھکائے بمشکل اپنی زندگی کا سب سے اہم راز بتا دیا —— طویل خاموشی سے گھبرا کر اس نے سر اٹھایا —— لڑکی کے چہرے

آئینے

"یار ڈوگر۔ کب جا رہا ہے ؟" سلطان جو بڑی دیر سے گھاس پر اُلٹا پڑا تھا یکایک سر اٹھا کر بولا۔ "بس یار — پرسوں صبح — ہا !" — شکر ہے سال بعد اپنے شہر جاؤں گا! ڈوگر کی آنکھوں میں بچھڑے شہر سے ملنے کی خوشی تھی — ہم سب ہی دوسرے شہروں سے حصولِ علم کے لئے آئے ہوئے تھے — اور آج ایم ۔ اے کے آخری سال کے آخری پرچے کے بعد یوں ہلکے پھلکے ہو گئے تھے جیسے صدیوں کا بوجھ کاندھوں سے اُتر گیا ہو — ہمارے دلوں میں ولولے تھے، کچھ کر گزرنے کے جذبے تھے، ایسا محسوس ہو رہا تھا ہم فاتحِ دنیا ہیں — اور اب اس مادرِ علمی سے باہر نکلیں گے تو ہر شخص ہماری پذیرائی کے لئے بے چین ہو گا — ہمیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ "ہاں یار — اپنا وطن پھر اپنا ہوتا ہے !" زرخان کے سرخ چہرے پر سنہری دمک اُتر آئی تھی۔

"میری سمجھ میں آج تک تم لوگوں کا یہ انوکھا تصوّرِ وطن نہیں آیا" میں نے زرخان کے دمکتے چہرے کو حسد بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا: "دیکھیں ناں — ملک پاکستان اور وطن مردان !"

زرخان کے جملے نے جیسے اس کے پورے وجود کو جگمگا دیا تھا۔

"تم — کہاں جاؤ گی ؟" نسرین نے پیالی اٹھاتے ہوتے پوچھا؛ "کوئٹہ — والد کا تبادلہ ہو گیا ہے !" میں نے بے دلی سے کہا۔

کبھی کبھی مجھے اپنے پر بہت غصہ آتا —— جب میرے دوست اپنے اپنے "وطن" کے قصے سناتے تو مجھے بہت مزہ آتا، وہ گلیاں، وہ جوہڑ، ایسے باغات، یہ ندیاں —— آخر میں کیوں محروم ہوں ان چیزوں سے ؟ —— اونہہ تم تو پاگل ہو —— "یہ PRIMITIVE لوگ ایک مخصوص دائرے میں رہتے ہیں - ان کی سوچ سمجھ کی سرحد بس ان کے گھٹے ہوئے ماحول ہی تک ہے —— دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اس کا انہیں علم نہیں" —— ایک روز میں نے اپنے فرسٹریشن کا ذکر اپنے ایک لیکچرر سے کیا تو انہوں نے طویل لیکچر کے بعد یہ جملہ کہہ کر اپنی بات ختم کردی - وہ شاید اپنا اصل بھول چکے تھے یا پھر چھوٹے دائروں پر یقین نہیں رکھتے تھے —— زرخان کی بات کے ساتھ ہی مجھے ان کی بات یاد آگئی تھی - وہ حافظ آباد کے رہنے والے تھے - ایک روز کراچی آگئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے. بائیس برسوں میں شاید ایک یا دو بار اپنے شہر گئے تھے اور بس ! ——

" یہ ہجرت کی کون سی قسم ہے ؟" —— اچانک بھری سبھا میں میں نے سوال اٹھایا - سب میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے ." تم کہاں پہنچی ہوئی ہو ؟" —— سلطان سیدھا بیٹھتے ہوئے بولا - تب میں نے اپنے استاد کا کہا ہوا جملہ سنایا ." یہ ہجرت نہیں —— اپنے آپ سے فرار ہے . ہجرت تو کسی بلند مقصد کے لئے کی جاتی ہے !

—— ڈاکٹر فلسفیانہ لہجے میں بولا .

" مثلاً ؟ ؟" میں نے پوچھا .

" مثلاً یہی کہ میرے والدین جالندھر سے یہاں آگئے —— آپ کے والدین نے پاکستان کو اپنا لیا !" اس نے کہا ." وہ کوئی بلند مقصد نہیں تھا —— ہمارے بزرگوں نے ہجرت ہمارے بہتر مستقبل کی خاطر کی - تاکہ معاشی طور پر استحکام ملے - یعنی وہ چیزیں ہمیں مل جائیں جن سے ہمارے بزرگ آہستہ آہستہ محروم ہو رہے تھے !" میرے لہجے میں تلخی اتر آئی تھی —— " یہ کیا کم بلند مقصد ہے کہ نسلوں کے مستقبل کو محفوظ کر دیا جائے !

زرخان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا: "یہ مقصد نہیں خودغرضی ہے!" میں نے ہٹ دھرمی سے کہا ـــــ دیکھئے میں سمجھتا ہوں کہ غرض ہی انسان کا اصل ہے ـــــ یہ نہ ہو تو دنیا کے کام رک جائیں۔ بلکہ کوئی کام ہی نہ ہو!

خاصخیلی جو بڑی دیر سے خاموش تھا بول پڑا۔

"میں تو ہاسٹل جا رہی ہوں ـــــ تم چلو گی؟"۔ ماہتاب نے اکتا کر کہا ـــــ

"میں تھوڑی دیر بعد آؤں گی!" میں نے جواب دیا۔

"میں بھی چلتی ہوں!" نسرین اپنی کتابیں اٹھاتے ہوئے بولی۔

"اوکے۔ جیسا چاہو!" ـــــ

میں نے سلمان کی طرف دیکھا جو اشارے سے نسرین کو رد کنے کے لئے کہہ رہا تھا

"نسرین! ـــــ تمہارا جانا ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں ـــــ بہت زیادہ!" ـــــ اس نے تیز نظروں سے سلمان کو گھورتے ہوئے کہا ـــــ اور دونوں کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

ہم سب ہی خاموش تھے ـــــ یوں لگ رہا تھا کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے۔ ہماری آخری شام تھی جو ساتھ گذر رہی تھی ـــــ میں نے ایک طائرانہ نظر یونیورسٹی کی ارد گرد پھیلی عمارت پر ڈالی۔ میرا شعبہ، لائبریری، درخت والی کینٹین۔ انتظامیہ۔ اور کیفے ٹیریا ـــــ نہ جانے اب کب یہاں آنا ہو! ـــــ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا: ـــــ

"ہاں ـــــ چار برسوں نے جہاں ہمیں علم سکھایا وہیں محبت کے آداب بھی اس مادرِ علمی نے عطا کئے!" ـــــ

زرخان کے لہجے میں اداسی تھی ـــــ "اب تو بس زندگی کا ایک پرزہ بننا ہے۔ یہ بے فکری، یہ دلچسپیاں، یہ محبتیں کہاں ملیں گی؟" ـــــ

ڈوگر سنجیدہ لہجے میں بولا :-

"ہاں ـــــ پتہ نہیں کل کیا ہو ؟

سلطان کے لہجے میں مستقبل کی تشویش نے سر اٹھایا :"ـ لڑکیوں کے مزے ـ ماں باپ کے گھر رہتی ہیں تو سکون ، یونیورسٹی میں آتی ہیں تو اطمینان اور پھر شوہر کے گھر حکمرانی ـــــ !"

ڈوگر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا :ـ" اب وقت بدل چکا ہے ـــــ میں اور تم ہم دونوں زندگی کی جہد میں برابر کے شریک ہیں !" ـــــ میں نے کہا ـ اور سب ایک بار پھر خاموش ہو گئے ـ

چند لمحے پہلے کی دلچسپ محفل پر سناٹا چھا چکا تھا ـــــ سب اپنے اپنے خیالوں میں غرق تھے ـ وقت تیزی سے ہمارے ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا تھا ـ

ستمبر شروع ہو چکا تھا ـ کوئٹہ کی شامیں سرد ہونے لگی تھیں ـــــ ہم سب لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے ـ

"میرا کوئی شہر کیوں نہیں ہے ؟" ـ اچانک میں نے اپنے والد سے پوچھا : وہ میرا جملہ سن کر حیرت بھری نظروں سے تکنے لگے ـــــ" یعنی ؟ ؟ ـــــ

یہ کوئٹہ تمہارا شہر نہیں ہے ؟" ـ انہوں نے چند لمحوں بعد پوچھا ـ اور میں مخمصے میں پھنس گئی ـ یہ اپنا تھا بھی اور نہیں بھی !" ـ نہیں " ! ـــــ

" جیسے گورکھپور آپ کا شہر تھا" ! میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـ اور اس ایک لمحے میں مجھے ان کی آنکھوں میں ڈوگر کی آنکھوں کی چمک ، ان کے چہرے پر زرخان کے چہرے کی دمکتی سنہری رنگت نظر آ گئی ـــــ

" بھئی ـــــ ! میں تو اتنا جانتا ہوں کہ جو زمین اور اس کی آب و ہوا آپ کو قبول کرے ، جہاں رہ کر آپ محفوظ رہیں وہی علاقہ آپ کا ہے اور بس !" ـــــ انہوں

نے ہنس کر کہا :

" یعنی یہ کہ ہم کسی بھی جگہ جاکر رہیں وہ ہمارا وطن ہو گا ؟" ــــ میں نے جرح کی۔

" ہاں ! اگر وہاں کی مٹی آپ کو قبول کرلے " ۔ وطن درحقیقت کوئی بنی بنائی چیز نہیں کہ کوئی آدمی اسے اپنا لے، بلکہ وطن بنانے کے لئے نسلیں درکار ہوتی ہیں۔ قبولیت تک پہنچنے کے لئے بہت سی چیزوں کی، جذبوں کی، خواہشات کی قربانی دینا ہوتی ہے !" ــــ انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

" گویا وہ جذبۂ تسکین کہ جس کے سہارے ہم کسی چیز کو اپنے وجود سے بڑھ کر سمجھنے لگتے ہیں، ہجرت کا، بھٹکنے کا متقاضی ہے ؟" ــــ میرے لہجے میں تلخی اتر آئی تھی۔

" نہیں ــــ مسلمان کے لئے یہ ساری زمین اس کا وطن ہے ــــ وہ سرحدوں میں نہیں بٹتا ــــ دنیاوی سیاست سے قطع نظر !" ــــ انہوں نے کہا اور کھڑے ہوگئے۔ مذہب کتنی اچھی چیز ہے ــــ ہر فرسٹریشن کا علاج ہے اس کے پاس چاہے وقتی ہی سہی ! ــــ اور میں ہنس پڑی۔ اپنی بے بسی پر یا شاید صدق کی طاقت ختم ہو جانے پر ! ــــ

" اٹھو بیٹا ! ــــ دس بج رہے ہیں !" ــــ امّی کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا، میں نے سرہانے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر دیکھا، پورا پورٹیکو برف سے ڈھک چکا تھا۔ سامنے لگے بادام کے درخت کی خشک ٹہنیوں کو برف نے ڈھانپ لیا تھا ــــ میں اس خوبصورت منظر میں گم ہوگئی۔

" تمہاری یونیورسٹی کے کچھ لڑکے آئے ہیں !" ــــ امی نے ہیٹر جلاتے ہوئے اطلاع دی، اور میں تیزی سے لحاف ایک طرف پھینک کر مسہری سے کود گئی۔

" کون آیا ہے امی ؟ ؟" ــــ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ مسکرا اٹھیں۔

" باہر جاکر خود دیکھ لو !" ــــ انہوں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ چند منٹ میں

منہ ہاتھ دھو کر میں تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف لپکی ـــــ وہ تینوں گرم جوشی سے کھڑے ہو گئے۔

" ارے واہ ! ـــــ دو برس بعد تم لوگ کہاں سے ٹپک پڑے ؟

میں خوشی سے چلّا اٹھی !

" بس ادھر آئے تو سوچا کہ آپ سے بھی ملاقات کریں ـــ بلکہ ادھر آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا ! ـــ ڈوگر نے کہا ،

" ارے بیٹھو ـــــ تم لوگ کھڑے کیوں ہو ؟ ـــــ میں نے زرخان اور معاذاللہ سے کہا ۔ معاذ اللہ کوئٹہ ہی کا رہنے والا تھا ، ہماری ہی یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے کیا تھا اور اس وقت ہم دونوں ایک ہی محکمے میں کام کر رہے تھے ۔

" ہمیں معاذاللہ کا تو علم تھا اس وجہ سے سیدھے اس کے گھر چلے گئے ـــ اس کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ آپ کو اچھی جاب مل گئی ہے اور کمپیٹیشن پر " زرخان کے لہجے میں خوشی تھی ۔

" اچھا یہ بتاؤ سلطان ، خاصخیلی ، اکبر ، ماہتاب وغیرہ کہاں ہیں ؟ کیا کر رہے ہیں ؟" ـــ میں نے ہیٹر کی آنچ تیز کرتے ہوئے پوچھا :

" نسرین کی خبر ہے ـــــ اس کی شادی ہو گئی ہے ـــــ اپنے کسی عزیز کے ساتھ ۔ سلطان چند ہفتے مجنوں بنا رہا ـــ مگر اب مرض میں افاقہ ہے ! ـــ خاصخیلی واپس عمر کوٹ چلا گیا ـــ اکبر ابھی کراچی ہی میں جوتیاں توڑ رہا ہے ـــــ اور ماہتاب کا کچھ پتہ نہیں ! ـــ ڈوگر نے ایک سانس میں سب کے بارے میں بتا دیا۔

" اب پوچھیے کہ ہم لوگ کیا کر رہے ہیں" ؟ ـــــ زرخان نے کہا :

کر کیا رہے ہوگے کہیں زبردست سرکاری افسر بن چکے ہوگے ـــ تمہارا مستقبل تو تمہارا ڈومیسائل ہے !" ـــ میں نے ہنس کر کہا ۔

"یہی تو آپ آج تک نہیں سمجھیں"! ـــــ ڈوگر کے لہجے میں مایوسی تھی ۔ میں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا جہاں انتشار کی لکیریں نمایاں تھیں۔ ـــــ

"خیریت ؟ ؟" ـــ میں نے حیرت سے پوچھا :

"یار ـــ دو سال ہو چکے ہیں مگر کہیں ڈھنگ کی نوکری نہیں ملتی، کہیں تجربہ نہیں ہوتا اور کہیں عمر آڑے آجاتی ہے ـ کئی ایک جگہ سفارش بھی کروائی، مگر بات بنی نہیں"۔ زرخان کے لہجے میں تھکن اُتر آئی تھی۔

"تو ..... تو ..... مگر ..... یقین نہیں آرہا"! ـــ میں واقعی حیران تھی ۔

"اپنے ساتھ بھی کم و بیش یہی ہوا ـــ پچھلے دنوں تایا کے ایک دوست وزیر ہو گئے ان سے بھی لکھوا کرلے گیا تھا، مگر کچھ بنا نہیں"! ـــ ڈوگر تیز جلتے ہوئے ہیٹر کو دیکھتے ہوئے بولا ۔

"آپ کو کیسے اتنی اچھی نوکری مل گئی ؟" ـــ اس نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔

"بتایا تو تھا کہ انٹرویو میں ان کے نمبر سب سے زیادہ تھے"! معاذاللہ بولا ۔

"یار پھر تو ـــ تمہارے صوبے میں آکر کام کرنا چاہیئے۔ کم سے کم قابلیت کی بنیاد پر تو نوکریاں مل جاتی ہیں"! ـــ ڈوگر بولا ۔

"ہاں کیوں نہیں ـــ مگر یار تمہارا طبقہ تو شاہانِ وقت کا ہے ـــ کامیابی کی دلیل، کامرانی کی نشانی"! ـــ معاذاللہ کے مسکراتے ہونٹوں نے تلخی سے کہا اور ایک لمحہ کو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

"اگر شاہانِ وقت ایسے ہوتے ہیں تو میں ابھی صوبہ برداری لکھنے کو تیار ہوں"! ڈوگر کی تیز ہنسی میں عجیب سی بے بسی تھی ۔

"تم لوگ تو صوبائیت پر اُتر آئے ۔ اپنی کچھ بات کرو"! زرخان بولا۔

"اپنی کیا بات کریں ـــ کون سننے والا ہے ؟ ـــ بس اپنے دکھ آپس ہی

یں کہہ کر رہ جاتے ہیں ـــــ لیکن مداوا کون کرے ؟ ؟" ڈوگر نے کہا ۔

" کیا یہ کم ہے ؟ ؟" میں بولی۔

" کم تو نہیں لیکن اپنی بات کہنے میں بھی اس وقت مزہ آتا ہے جب ـــــ معاشی طور پر آپ مطمئن ہوں ! ڈوگر دیوار پر لگے کیلنڈر کو غور سے دیکھتا ہوا بولا ۔

" اچھا یہ بتاؤ کہ خاصخیلی کو کہیں نوکری ملی ؟" ـــــ میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوتے کہا ۔

" ہاں ـــــ سیکرٹریٹ میں مل گئی تھی ـــــ مگر وہ گیا نہیں ـــــ کہتا ہے کہ اسلام آباد بہت دور ہے !" ـــــ ڈوگر بولا ۔

" اِسے کہتے ہیں کفرانِ نعمت !" زرخان بولا ۔

" میرا خیال ہے کہ اسے نوکری کی ضرورت نہیں ہے ، اچھی خاصی جائیداد ہے ، دواؤں کی تین چار دوکانیں ہیں ـــــ نوکری تو ہم آپ جیسوں کی ضرورت ہے !" معاذ اللہ بولا ۔

" ٹھیک کہتے ہو ـــــ پستے تو ہم لوگ ہیں ـــــ جن کے پاس کچھ بھی نہیں !" ڈوگر بولا۔

" کم سے کم کوئی زمین تو تمہاری ہے ـــــ کسی جگہ کو تو اپنا کہہ سکتے ہو ـــــ کوئی علاقہ ، کوئی شہر تمہاری پہچان تو ہے !" میں نے تسلی بھرے لہجہ میں کہا ۔

" آپ ابھی تک زمین اور پہچان کے چکر سے نکلی نہیں ہیں ۔ آپ یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ سوسائٹی میں آپ کا ایک اسٹیٹس بن چکا ہے ، چند لوگ آپ کو جانتے ہیں۔ ہم اپنے علاقے سے نکل کر اجنبی بن جاتے ہیں ـــــ بالکل اسی طرح ـــــ جیسے کوئی ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک میں تنہا رہ جاتا ہے !" ڈوگر نے طویل سانس بھرتے ہوئے کہا ۔

" ارے یہ انقلاب کیسا ؟ ـــــ تم لوگ تو بہت تڑپا کرتے تھے !" میں نے کہا۔

"اس وقت ہم معاشی طور پر آزاد تھے ــــ کوئی فکر نہ تھی ــــ وہ تڑپ اب کہیں جا دبی ہے ــــ جو زمین صرف ہماری پہچان بن جاتی ہے، ہمیں شناخت دیتی ہے ــــ مگر ہمیں قولیت نہیں بخشتی ــــ جہاں ہمارے پیٹ کا ایندھن دھکتا رہتا ہو ــــ وہ کسی ناطے سے ہمارا علاقہ ہو یا کسی رشتے سے ہماری زمین ہوئی ــــ ہم اسے کیسے اپنا کہہ سکتے ہیں؟ ــــ اور میرا دماغ جیسے گھومنے لگا ــــ" جب پیٹ بھرا ہو ــــ جیب میں سکّے ہوں تو پرائے بھی اپنے بن جاتے ہیں ــــ اور یہ سب نہ ہو تو زمین بھی اپنی نہیں رہتی"! زرخان اٹھتے ہوئے بولا۔

" آپ کا فرسٹریشن ویسا ہی تھا ــــ جیسے ہماری تڑپ ــــ آپ ایک کامران انسان ہیں۔ آپ کے پاس اس وقت وہ سب چیزیں ہیں جو کسی بھی انسان کا افتخار ہے ــــ یہ معاذ اللہ آپ کو اپنا کہتا ہے ــــ یہ شہر آپ کو اپنی شناخت جانتا ہے ــــ یہاں کے دفاتر کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں ــــ اب بتایئے بے وطن ہم ہیں یا آپ؟؟" ــــ ڈوگر کے جلتے ہوئے جملے نے جہاں مجھے ایک لمحہ میں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا تھا ــــ وہیں بے وطنی کا شدید احساس، بے زمینی کا کرب ایک بار پھر مجھ پر چھا گیا ــــ لیکن اس بار یہ بے وطنی اپنی نہیں تھی ــــ اس بار بے وطنی کے قافلے کے مسافر ڈوگر اور زرخان تھے!!

۱۹۸۵ء اسلام آباد

قانونِ قدرت

وہ کسی طور شادی پر راضی نہ ہوتی تھی ——— وہ بھی جانے کیوں شادی کے سخت خلاف تھا۔ تب ایک جگہ ایک تقریب میں دونوں کی ملاقات ہوئی —— یہ ملاقات چند مہینوں میں دوستی میں بدل گئی ——— اس کے ماں باپ کو امید بندھ گئی کہ شاید ان کی بیٹی اب شادی کر لے ——— ان کی دوستی کو تین برس ہو چکے تھے —— اور وہ صرف دوست ہی تھے —— اس کے ماں باپ خاندان اور دنیا والوں کی باتوں سے عاجز آ چکے تھے —— تب ایک دن اس کی ماں بلک پڑی —— باپ کی حالت پر دہل کر رہ گئی۔

"کیا میں اپنے ماں باپ کو کوئی سکھ نہیں دے سکتی؟" —— یہی سب سوچ کر اس نے اپنے دوست کو ساری بات بتا دی۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے ——— اور میں بھی اسی عذاب سے گزر رہا ہوں — مگر ..... مگر ....."

"ہاں! ہاں کہو!" —— اس نے سہارا دیا۔

"بات یہ ہے ..... کہ ..... کہ ..... میری نفسیات ..... یعنی کہ ..... کچھ عجیب سی ہے ..... مقصد یہ ہے کہ ..... کہ ..... میں اپنے ہم جنس سے ہی مطمئن رہ سکتا ہوں!" —— اس نے گردن جھکائے جھکائے بمشکل اپنی زندگی کا سب سے اہم راز بتا دیا —— طویل خاموشی سے گھبرا کر اس نے سر اٹھایا —— لڑکی کے چہرے

کے عجیب تاثرات تھے ـــــ سرخی ـــــ نہ جانے کس چیز کی ! ـــــ حیرت ـــــ نہ معلوم کس جذبہ کی ! ـــــ آنکھوں میں چمک ـــــ انجانے سے خیال کی ـــــ

" پھر تو ـــــ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہوتے نا !" ـــــ لڑکی کی آواز سن کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

" ہاں ! ـــــ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں !" ـــــ اس نے رسانیت سے کہا۔

" ٹھیک ہے ـــــ پھر ہم دونوں شادی کر لیتے ہیں ـــــ بس ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیں گے !" ـــــ اس نے پہلی بار لڑکی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

ان کی شادی کو چھ برس بیت چکے ہیں ـــــ اب وہ دونوں ایک پھول سی بچی کے والدین ہیں ـــــ مگر آج بھی انہیں حیرت ہے یہ کیسے ہوا ؟ کیوں ہوا؟ کب ہوا ؟؟؟

کراچی ۱۹۷۹ء

"سرسید نگر چلنا ہے !" کلاوتی نے ایک موڑ پر رکشہ والے سے کہا اور میں چونک پڑی۔

"کیا سوچ رہی ہو!" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں ــــ یہاں دلّی کے مقابلہ میں ٹھنڈ کافی ہے !" ــــ میں نے ابر آلود موسم کو دیکھتے ہوئے کہا؛

"ہاں ــ شاید رات بھر بارش ہوتی رہی ہے !" ــــ اس نے رکشہ کے دھچکوں سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"کس قدر خاموشی ہے ــــ کس قدر سناٹا ہے !" ــــ میں بڑبڑائی۔

"جناب ہندوستان میں زندگی اب بھی سائیکل رکشوں پر سفر کر رہی ہے !" ــــ کلاوتی زور سے ہنس کر بولی۔

اس سے میری ملاقات چند گھنٹے پہلے ٹرین میں ہوئی تھی۔ وہ مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کر رہی تھی اور میں یہاں اپنے والد کی ایک خالہ زاد بہن خاور جہاں سے ملنے آئی تھی۔ کلاوتی ان کو جانتی تھی۔ کالج میں ان کی شاگرد رہ چکی تھی۔

"تم یہاں کتنے دن رہو گی ؟" ــــ اس نے پوچھا۔

"بس پانچ چھ دن ــــ اس کے بعد دلی ــــ اور دلی سے لاہور !" ــــ

میں نے سائیکلوں پر آتے جاتے لڑکے لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آگرہ ضرور جانا!" ـــــ اس نے تاکید کی۔

"ہاں ـــــ ویزا لے کر آئی ہوں!" ـــــ میں نے اونی مفلر اچھی طرح لپیٹتے ہوئے کہا۔

اب ہم ایک صاف ستھرے علاقے میں داخل ہو چکے تھے یہ رہائشی علاقہ تھا۔

"بس ـــــ بس یہاں روک لو!" کلاوتی نے ایک گھر کے سامنے رکشہ رکواتے ہوئے کہا۔

"بس یہ سامان اتار کر اندر لے آؤ ـــــ اور مجھے عبداللہ ہال جانا ہے!" اس نے میرے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہدایت دی اور رکشہ والا سعادت مندی سے احکام کی تعمیل میں لگ گیا۔

کافی دیر گھنٹی بجنے کے بعد دروازہ کھلا ـــــ ایک ادھیڑ عمر کی خوبصورت نکھری نکھری خاتون نے دروازہ کھولا۔

"ارے کلا ـــــ کہاں رہیں اتنے دنوں؟" ـــــ انہوں نے کلاوتی کو گلے لگاتے ہوئے اجنبی نظریں مجھ پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ـــــ خاور آپا، بنارس چلی گئی تھی ماتاجی نے بلایا تھا۔ پھر دلّی رک گئی ماما کے بیٹے کی شادی تھی ـــــ اور دلّی سے یہ آپ کی ایک مہمان مل گئیں" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ان کی آنکھوں میں اجنبیت تھی ـــــ وہ مجھے دیکھ رہی تھیں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"میں وجاہت علی کی بیٹی ماریا ہوں!" ـــــ میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور انہوں نے لپک کر مجھے اپنی باہوں میں بھر لیا۔

"ارے میری بچی ـــــ اتنی بڑی ہو گئی ـــــ کیسا کیسا نہ تڑپی تجھے دیکھنے

کو۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔ سوچ بھی نہیں۔۔۔۔ سکتی تھی۔۔۔۔ کہ اپنی پھپھو سے ملنے ۔۔۔۔ تو خود آجا۔۔۔۔ ئے۔۔۔۔ گی۔۔۔۔ ! وہ ہچکیوں اور سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ ان کی تڑپ اور محبت نے میرے اندر چھپے ہوئے خدشوں کے جمود کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا اور اب میں بھی ان کے ساتھ سسک رہی تھی !"

"تم بھی کیا کہو گی کہ خوب استقبال کیا پھپھو نے !" —— کافی دیر بعد وہ سنبھلیں تو مجھے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولیں۔

"اچھا خاور آپا —— میں چلتی ہوں !" —— کلاوتی نے اجازت چاہی۔

"سفر سے آئی ہو —— چائے وغیرہ پی کر جانا" —— انہوں نے کلاوتی کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں سامان رکشہ میں رکھا ہے —— ایک دو دن میں آؤں گی !" اس نے کہا اور آداب کر کے چلی گئی۔

میں باورچی خانے میں بیٹھی مٹر چھیل رہی تھی —— خاور پھپھو کھانا پکا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ سارے خاندان کی باتیں بھی بتاتی جا رہی تھیں، کون کہاں چلا گیا، کون لوگ ختم ہو گئے، کتنے علی گڑھ میں باقی رہ گئے۔

"پھپھو —— آپ کبھی پاکستان نہیں آئیں ؟" میں نے چھلی ہوئی مٹر کی تھالی انہیں دیتے ہوئے پوچھا۔ پتیلی میں ڈوئی چلاتے چلاتے ایک لمحہ کو ان کا ہاتھ جیسے رک گیا۔

"ہاں بیٹا —— شاید یہ میری قسمت میں نہیں تھا —— جتنی بار ارادہ کیا کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو گئی —— تمہاری پیدائش پر آنے کا پورا ارادہ تھا مگر انہی دنوں میری بڑی بہن کا انتقال ہو گیا۔ تمہارے چھوٹے چچا شباہت کی شادی پر آنے کا سوچا تو جنگ چھڑ گئی —— اس کے بعد امّی ابا اللہ کو پیارے ہو گئے اور پھر تو میرا نکلنا ناممکن

ہو گیا !" ــــ انہوں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تو کیا یہ سارا عرصہ آپ نے اکیلے ہی گزار دیا ؟" ــــ میں نے دکھ اور حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ــــ مگر عاکف کی ذمہ داری نے احساس نہیں ہونے دیا !" ــــ انہوں نے پتیلی کو ڈھکن سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہ عاکف کون ؟" ــــ میں نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"میں نے بتایا نا کہ میری بڑی بہن کا انتقال ہو گیا تھا ــــ اس وقت عاکف چار برس کا تھا ــــ بہنوئی نے چند ماہ بعد دوسری شادی کر لی اور عاکف کو میں نے گود لے لیا۔ آجکل تو یہاں یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے ــــ کسی کام سے کانپور گیا ہوا ہے ــــ کل صبح آئے گا تو ملنا !" ــــ انہوں نے چولھا بند کرتے ہوئے کہا۔ رات کھانے کے بعد میں ان کی مسہری پر نیم دراز پرانی تصویریں دیکھ رہی تھی، ابو کی طالب علمی کے زمانے کی تصاویر، پھپھو کی نوجوانی کی تصویریں، میرے بچپن کی تصویریں۔

"پھپھو ــــ جوانی میں تو آپ غضب کی حسین تھیں !" ــ میں نے ان کی ایک تصویر اشتیاق سے دیکھتے ہوئے کہا اور وہ ہولے سے مسکرا دیں۔

"واہ ! مزہ آگیا تصویریں دیکھ کر ــــ آپ نے تو میرا بچپن تک محفوظ کر لیا !" میں آرام سے تکیے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ انہوں نے تمام تصاویر جمع کر کے لکڑی کے ایک صندوق میں رکھ دیں اور میرے ساتھ ہی لیٹ گئیں ــــ وہ ہولے ہولے باتیں کرتی رہیں اور میرے بالوں میں اپنی نرم نرم انگلیوں سے کنگھا کرتی رہیں اور میں نیند کی وادیوں میں اترتی چلی گئی۔

"پھپھو ..... آپ ..... بالکل ..... میری ..... امی ..... کی ..... طرح ..... ہیں ..... وہ ..... بھی ..... ایسے ہی ..... رات میں مجھے سلاتی ہیں !"

میں نے بمشکل آنکھیں کھول کر کہا۔

"ہاں میری جان میں تیری ماں ہی تو ہوں!" ان کی آواز کے ارتعاش کو میں نے نیند کا دھوکا سمجھا اور جانے کس وقت سو گئی۔

"ارے آہستہ بول ـــــ ابھی وہ سو رہی ہے! تیری تو نہ جانے کیا عادت ہے شور مچاتا ہوا گھر میں داخل ہوتا ہے!" پھپھو کی پیار بھری سرزنش سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔

"گیارہ بج رہے ہیں ـــــ کیا رت جگا کرتی رہی ہیں آپ لوگ؟" ایک گھمبیر مردانہ آواز نے کہا ـــــ یہ یقیناً عاکف تھے۔

"آواز تو اچھی ہے!" ـــــ میں نے مسکرا کر سوچا اور جسم سے اترا ہوا لحاف گردن تک کھینچ لیا۔

"ہاں ـــــ رات خاصی دیر میں سوئے ہم لوگ!" ان کی آواز آئی۔

"ہوں ـــــ جب ہی آپ آج کالج نہیں گئیں!" مردانہ آواز ہنسی۔

"نہیں جاگ تو میں اپنے وقت پر گئی تھی ـــــ کالج سے ہفتہ بھر کی چھٹی لے لی ہے۔ جب تک ماریا یہاں ہے کوئی کام نہیں کروں گی!" ـــــ ان کی آواز کی ممتا نے جانے کیوں مجھے آبدیدہ کر دیا۔

"خالہ جان! میں آپ کی محبت میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کر سکتا ـــــ واہ ـــــ کل کی آئیں اور میری خالہ پر قبضہ جما لیا" ـــــ آواز نے احتجاج کیا۔

"اچھا چل ـــــ تیری اپنی جگہ ہے اس کا اپنا مقام!" ـــــ پھپھو ہنس کر بولیں۔

"کیسا مقام اور کونسی . . . . ."

"بیکار کی حجت بازی نہ کر مجھ سے ـــــ اور ہاں سن ـــــ تو بھی چند دنوں کی چھٹی لے لے ـــــ آخر ماریا کو گھمانا پھرانا ہو گا، عزیزوں سے ملوانا ہو گا" ـــــ پھپھو نے بات کاٹ کر ہدایت دی۔

"ارے آپ یہ سب کام کر لیجئے گا میں کہاں ٹانگے ٹانگے پھروں گا !" ــــ آواز میں
اکتاہٹ تھی اور میں لجلچا کر رہ گئی ۔

"ٹھیک ہے تو مختار ہے !" ان کی آواز مدھم پڑ گئی ۔

"ارے واہ خالہ جان ! ــــ آپ تو سنجیدہ ہو گئیں ــــ میں تو مذاق کر رہا تھا ــــ بس
ابھی گیا ڈیپارٹمنٹ اور چھٹی لے کر آیا ــــ" آواز نے خوش دلی سے کہا ۔

"اچھا جا ــــ جلدی سے !" پھپھو کھلکھلائیں ۔

"میرے خیال میں خالہ جان آپ رکشے سے چلی جائیے ــــ میں اور ماریا پیدل مارچ
کرتے ہوئے آتے ہیں !" ــــ ہم پھپھو کے ایک ملنے والی کے گھر سے نکلے تو عاکف نے
تجویز پیش کی ــــ انہوں نے ایک لمحہ کو ہمیں سنجیدہ نظروں سے دیکھا پھر اپنی مخصوص
مشفقانہ مسکراہٹ سے بولیں :

"ٹھیک ہے ــــ ماریا کو کالونی بھی دکھا دینا !" اور عاکف کے سہارے
سواری پر بیٹھ گئیں ــــ ہم نے دوسرا رکشہ واپس کر دیا ۔

"کیا بات ہے ــــ بہت سست رفتار ہوتے ہیں پاکستانی !" ــــ چلتے چلتے
اچانک عاکف نے کہا ۔

"ہمارے ہاں زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ یہاں کا سکون بہت اجنبی لگ رہا
ہے" ــــ میں نے سرد موسم کی ٹھنڈک کو اپنے وجود میں اتارتے ہوئے کہا ۔

"اگر اتنا ہی سکون ہے تو رہ جاؤ یہیں" : انہوں نے مسکرا کر کہا ۔

"اونہوں ــــ ہم لوگ تیز رفتاری کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ یہ سکون ہمارے
اعصاب کو تھکا دے گا !" ــــ میں نے کہا ۔

"گویا دوسرے معنوں میں ہمارا شہر سست رفتار ہے !" ــــ وہ بولے ۔

"بہت سست !" ــــ میں ہنسی

"اچھا ماریا! یہ بتاؤ اگر میں پاکستان آؤں تو کہاں ٹھہراؤ گی؟" ___ کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔
"آپ کہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں؟" میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کسی بہت ہی اچھی سی جگہ!" ___ ان کی آواز میں بہت کچھ کا احساس ہوا۔
"ہوں ___ یوں تو ہمارے ہاں ہوٹل، موٹیل، سرائے وغیرہ سب ہی ہیں مگر..."
"مگر کیا؟؟" ___ انہوں نے بے تابی سے میری بات کاٹ کر پوچھا۔
"مگر یہ کہ اسٹیشنوں پر پندرہ روپے فی چارپائی رات بھر کے لئے مل جاتی ہے کھٹمل مچھروں کی سنگت میں بدبودار بستر پر خوب مزہ آئے گا ___ ہوٹلی فیل کریں گے آپ!" میں نے ہنسی دباتے ہوئے کہا ___ اور عاکف کا ایک جاندار قہقہہ فضا میں گونج گیا۔
"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟" ___ ایک موڑ مڑتے ہوئے پھر انہوں نے پوچھا ___
"کون سی بات؟" ___ میں جو اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی چونک پڑی۔
"ارے وہی ...... "
"اوہ ___ وہ ٹھہرنے والی بات!" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے مسکرا کر پوچھا ___
"بالکل!" ___ وہ چہکے۔
"ارے پارٹنر! ___ پریشانی کی کیا بات ہے ___ میرے گھر میں رہیئے گا بلکہ میرے کمرے میں!" ___ میں نے کہتے ہوئے بے اختیاری میں ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ ایک لمحہ کو ٹھٹک کر رہ گئے۔
"ارے؟؟ ___ کیا ہوا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"کک ... کچھ نہیں!" ___ وہ ہکلائے
"اوہ ___ اچھا!" ___ میں نے ہنستے ہوئے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ہاں تو اگر میں تمہارے کمرے میں رہ پڑا تو تم تو کمرہ بدر ہو جاؤ گی!"___ تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولے___ میں مسکرا اٹھی۔

"کمرہ بدر کیوں؟___ میں بھی وہیں رہوں گی!"___ میں نے رسانیت سے کہا۔

"تت۔۔۔۔ تم!" ان کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز رک گئی۔

"تو کیا ہوا؟ آخر کو آپ میرے کزن ہیں کوئی غیر تو نہیں!"___ میں نے ان کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا اور وہ خاموش ہو گئے۔

"ماریا!___ اگر سردی لگ رہی ہو تو میرا کوٹ لے لو!"___ کافی دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے پھر کہا۔

"ارے نہیں ___ اچھی سنگت میں آدمی ہر دنیاوی معاملات سے بیگانہ ہو جاتا ہے!" میں نے کہا___ اور پھر گھر تک وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ ہم گھر پہنچے تو پھپھو ایک خوبصورت سی لڑکی کے ساتھ کھانے کی میز پر برتن لگوا رہی تھیں۔

"کہو مزہ آیا؟ کیسی لگی کالونی؟"___ انہوں نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھی ___ صاف ستھری یونیورسٹی کالونی ہے۔ کافی مزہ آیا!"___ میں نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"تارہ ___ یہ ہے ماریا میری بھتیجی اور ماریا یہ تارہ ہے عاکف کی پھپھو زاد بہن ___ یہاں کالج میں پڑھ رہی ہے ___!" پھپھو نے ہم دونوں کا تعارف کرایا___ اور وہ مسکرا دی۔ ہم سب کھانے کی میز کے گرد بیٹھ چکے تھے۔

"تارہ جاؤ بیٹا عاکف کو بلا لاؤ کتنی دیر لگائے گا کپڑے بدلنے میں!" ___ پھپھو نے تارہ سے کہا اور وہ مستعدی سے اٹھ گئی۔ عاکف کا کمرہ میرے عین سامنے تھوڑا سا بائیں طرف تھا۔ تارہ نے آہستہ سے بند دروازے پر دستک دی۔

" آرہا ہوں !" اندر سے ان کی آواز آئی۔ چند لمحے انتظار کے بعد تارہ نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

" اوہو! ــــ بس کرو ...... ما ...... " کھلے دروازے میں کھڑے عاکف خاموش ہو گئے۔

" میں ماریا نہیں تارہ ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا اور مڑ کر کھانے کی میز کی طرف چلی آئی ــــ اور میں مسکرا دی۔

" کمال ہے ــــ میں تو سمجھا تھا ماریا ہے جو اتنی زور سے دروازہ پیٹ رہی ہے ــــ ہماری لڑکیوں کا یہ شیوہ تو نہیں کہ آندھی طوفان کی رفتار سے چلنا شروع کر دیں!" کرسی گھسیٹتے ہوئے عاکف ہنس کر بولے ــــ میں نے تارہ کی طرف دیکھا چند لمحے پہلے کی سنجیدگی کی جگہ اب اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔

" جناب جب طوفان آتا ہے تو خس و خاشاک کی طرح مضبوط سے مضبوط چیزوں کو بہالے جاتا ہے !" ــــ میں نے معنی خیز جملہ کہا۔

" طوفانوں پہ بند باندھنا ہمیں بھی آتا ہے !" عاکف نے سالن طشتری میں نکالتے ہوئے کہا۔

" خیر اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا !" میں ہنسی۔

" وقت تو ......"

" اچھا اسے کھانا تو کھانے دے تُو تو بحث شروع کر دیتا ہے !" ــــ وہ جانے کیا کہنا چاہ رہے تھے کہ پھپھو کی مداخلت نے خاموش کر دیا۔

میں بس کے شیشے سے منہ چپکائے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی ــــ پھپھو میرے برابر بیٹھی تھیں ــــ عاکف سامنے والی نشست پہ ــــ ایک بار انہوں نے سر گھما کر دیکھا۔

"بہت محو ہو؟"____ وہ مسکرائے۔

"آں ____ ہاں آپ کا ہندوستان دیکھ رہی ہوں!"____ میں نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم لوگ دو یوم کے لئے آگرہ جا رہے تھے۔ پاکستان کے بہت کم علاقے ایسے ہیں جو میں نے نہیں دیکھے ____ لیکن جتنی غربت مجھے یہاں نظر آ رہی تھی وہ پاکستان میں مفقود تھی۔ اپنے ہاں غریب سے غریب آدمی ننگے بدن ننگے پیر نظر نہیں آئے گا اور یہاں ____ مردوں کے پاس لنگی تھی تو بنیان ندارد ____ عورتیں اگر پیوند لگی ساڑھیاں پہنے نظر آئیں تو اکثر کے بلاؤز غائب ____ بلاؤز پورا ہے تو ساڑھی کے نام پر جسم سے بندھا ہوا کپڑا بدن کو ڈھانکنے کی کوشش ناتمام میں مصروف ____ اور نہ جانے کیا کیا سوچتے میری آنکھ جھپک گئی۔

"چلو بہن جی اترو!"۔ ایک آواز سے میں چونک پڑی ____ بس کا اڈہ آچکا تھا!

____ اس روز سارا دن فتح پور سیکری میں رہنے کے بعد شام چھ بجے ہم تھکے ہارے ہوٹل پہنچے۔

"واقعی پھپھو کیا شاندار نشانات ہیں ماضی کے!" میں نے بستر پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا ____ اب تو صرف ماضی کے نقش ہی رہ گئے ہیں"۔ وہ آرام سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"مگر ____ غربت بھی بہت ہے!"____ میں نے کہا۔

"ہاں ____ بڑا ملک ہے نا ____ آبادی زیادہ ہے اور منصوبہ بندی نامناسب، غربت تو ہونا ہی ہے!"____ عاکف جو ایک طرف آنکھیں موندے کرسی سے پشت ٹکائے بیٹھے تھے ____ بول اٹھے۔

"مجھے یہاں آکر احساس ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی خاص مستقبل نہیں

ہے!" میں نے عاکف کی طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں — جو پڑھے گا لکھے گا — وہ ہر جگہ اپنا مقام بنا لے گا — اصل چیز محنت ہے!" — پھپھو اٹھ کر غسلخانے کی طرف جاتے ہوئے بولیں۔

"عاکف! چائے تو منگوا لیجئے — بہت تھکن ہو رہی ہے!" میں نے نیم وا آنکھوں سے عاکف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم تھوڑی دیر کے لئے سو جاؤ — تازہ دم ہو جاؤ گی۔ جب اٹھو گی تو پھر چلیں گے تاج دیکھنے!" — ان کی نگاہوں کا والہانہ پن مجھ سے چھپا نہ رہ سکا۔

"اس وقت؟؟ — کل تو گئے تھے!" میں نے گردن اٹھا کر کہا۔

"چاندنی میں تاج کا نظارہ کچھ اور ہی ہوتا ہے — گھپ اندھیرے میں جب چاند کی روشنی اس عظیم الشان عمارت پر پڑتی ہے تو سفید سنگِ مرمر جیسے بولنے لگتا ہے — اور آدمی — اس کے حسن میں گم ہو کے رہ جاتا ہے!" — ان کے لہجے میں نشہ تھا۔

"ایسی بات؟؟ تو لیجئے میں ہو گئی تازہ دم!" — میں نے ایک دم بیٹھتے ہوئے کہا اور ان کے لبوں پر ایک دل موہ لینے والی مسکراہٹ تھرک کر میرے اندر جیسے اتر سی گئی۔

"کیا ہوا؟" — وہ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر بولے۔

"کچھ نہیں — وہ منگوا لیئے!" میں نے فون کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ چائے!" — وہ ایکدم ہنس پڑے اور ریسیور اٹھا لیا۔

ہم دونوں کے بے حد اصرار کے باوجود پھپھو نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ ان کے پاؤں میں درد تھا۔

"مگر پھپھو — آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی!" میں نے ضد کی۔

"ارے بیٹا ـــــ میرا کیا ہے ـــــ تم چلی جاؤ ـــــ کون سا روز روز آؤ گی اور پھر اتنی عمر اکیلے گزار دی ـــــ اب میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا!" ـــــ انہوں نے بظاہر مسکرا کر بہت بڑی اذیت کا اظہار کر دیا تھا۔

رات کے دس بج رہے تھے ہم دونوں چاندکی روشنی میں نہاتے ہوئے تاج محل کے سامنے کھڑے تھے۔

"ماریا تم ٹھیک کہہ رہی تھیں ـــــ یہاں ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے ـــــ" ـــــ وہیں ایک جگہ زمین پر بیٹھتے ہوئے عاکف نے سوچ سے لبریز لہجے میں کہا۔

"تو ـــــ کہاں ہے مستقبل ؟" ـــــ میں نے ان پہ جھک کر پوچھا ـــــ وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتے رہے پھر مسکرا کر بولے۔

"پاکستان میں !" ـــــ

"تو چلئے ـــــ انتظار کاہے کا ہے ؟" ـــــ میں نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ میرے ہاتھ کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ ہم نہ جانے کب تک اس حسین منظر کو اپنی روحوں میں اتارتے رہے۔

"ماریا !" ـــــ ان کی گھمبیر آواز نے پکارا۔

"جی !" ـــــ میری بے خودی نے جواب دیا۔

"کچھ بولو نا !" ـــــ وہ میرے سراپے پہ نظریں دوڑاتے ہوئے بولے۔

"کیا بولوں عاکف !" اور میں خاموش ہو گئی۔ اس ماحول اور انوکھے حسن میں میں جیسے گم ہو کر رہ گئی ـــــ مبہوت تھی ـــــ بس ایک بے خودی کے عالم میں عاکف کے ہمرکاب تھی۔

"یہ دیکھو ـــــ یہاں کبھی دریا اس تاج کے قدم چومتا تھا ـــــ اب تو وقت کے دھارے نے ان کے درمیان ایک خشک خلیج حائل کر دی ہے !" ـــــ انہوں نے

ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ــــ وقت بہتوں کو دور کر دیتا ہے !" ان کی بات سن کر میرا لہجہ جانے کیوں کپکپا گیا تھا۔

"اور ــــ کبھی انجانوں کو مِلا بھی دیتا ہے !" ان کے لفظوں نے یقین دلایا۔

"پتہ نہیں!" ــــ میں نے مبہم سا جواب دیا اور پھر خاموش ہوگئی۔

"جب پورا چاند دریا کی لہروں پر ہلکورے لیتا ہے ......" "تو معلوم ہے اس وقت ایک شاہجہاں اور ممتاز محل جنم لیتے ہیں!" ــــ عاکف کے سرشار لفظوں نے میرے ادھورے جملے کی تکمیل کر دی، میں مڑی ــــ وہ میرے عین سامنے کھڑے تھے ــــ ہم دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے ــــ شاید ممتاز محل اور شاہ جہاں کی روحیں ہم میں سما چکی تھیں۔

"تم نے ماریا ــــ تم نے کبھی کسی کو چاہا ہے؟" ــــ ان کی بے خود نظروں نے بہ مشکل لفظوں کو سہارا دیا ــــ اور میں جانے کیسے اچانک ہی ان کے بھرے بھرے وجود میں سما گئی۔

"ماریا ! میری روح مجھے معلوم نہیں تھا کہ محبت اس طرح اچانک ہی انسان کو بے بس کر دیتی ہے ــــ میں بہت جلد پاکستان آؤں گا ــــ بہت جلد میری جان اور پھر ــــ" اور وہ جانے کیا کیا کہتے رہے ــــ مجھے تو بس ایک نرم مگر مضبوط ہاتھ کا لمس یاد رہ گیا جو مسلسل میری پیٹھ پر، کمر پر، میری روح پر، میرے وجود پر ــــ نرم روی سے اپنی محبت کی داستان تحریر کر رہا تھا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا ــــ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بس ایک عجیب سا سرور رگ وپے پر طاری تھا ــــ میں آنکھیں موندے اسی بہاؤ میں بہہ رہی تھی ــــ کہ اچانک گہری نیند سوئی ہوئی پھپھو نے کروٹ لی ــــ میں

چونک پڑی ـــــ وہ کچھ کہہ رہی تھیں، میں اٹھ کر ان کی مسہری کے قریب گئی وہ نیند میں بڑبڑا رہی تھیں ـــــ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میری روح جسم سے کھینچ لی ہو۔

آگرے کا دو دن کا سفر میری زندگی کا یادگار سفر تھا ـــــ اس سفر میں مَیں نے بہت کچھ پالیا تھا مگر حصول کے اس نشہ میں جیسے کہیں کوئی پھانس اٹک سی گئی تھی۔ ہم رات ہی آگرے سے آئے تھے ـــــ صبح ہوتے ہوتے جاتے کتنی دیر ہو چکی تھی۔ مگر میں شاید نیند میں ہی تھی کہ پھپھو کی تیز آواز نے مجھے گویا جھنجھوڑ دیا ـــــ وہ برانڈے ہی میں بیٹھی تھیں۔

"تیرے مستقبل کو یہاں کون سا گھن لگ رہا ہے جو تو نے پاکستان جانے کا سوچا؟" ان کی آواز برمے کی مانند میرے کانوں میں اترتی چلی گئی۔

"بس خالہ جان میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں! ـــــ اکتا گیا ہوں یکسانیت کی اس زندگی سے!" عاکف کی متین آواز نے مجھے سہارا دیا۔

"ہندوستان بہت بڑا ملک ہے، کلکتہ چلے جاؤ، دلّی چلے جاؤ۔ مگر یہ پاکستان جانے کی کیا سوجھی؟" ان کی آواز میں ہلکا سا غصہ تھا۔

"خالہ جان! ـــــ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آپ میرے ساتھ چلیں گی!" عاکف نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کر!" پھپھو نے جھڑکا۔

"آخر ایسا کون سا طوفان کھڑا ہو گیا ہے ـــــ ایک خواہش ہی کا تو اظہار کیا ہے!" ان کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

"بیٹا ـــــ تم جسے خواہش کہہ رہے ہو ـــــ وہ صرف خواہش نہیں ہے، بہت بڑا المیہ ہو گا!" پھپھو کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں ؟" ـــــ عاکف کے لہجے میں تیزی آگئی تھی ۔

"سمجھ ہی تو رہی ہوں ـــــ جبھی تو کہہ رہی ہوں !" پھپھو کی آواز میں فیصلہ کن ٹھہراؤ تھا ۔

"خالہ جان . . . . . "

"دیکھ عاکف تجھے جانا ہے تو شوق سے جا ـــــ مگر میں رتی بھر یہاں سے نہیں ہلوں گی "۔ ان کی آواز کمرے کے قریب سے آتی سنائی دی اور میں نے جھٹ آنکھیں موندلیں ـــــ عاکف بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے ۔

"کیا بات ہے کیوں اسقدر سناٹے چھائے ہوئے ہیں آپ پر ؟" شام عاکف کے ساتھ میں پولیس اسٹیشن پر خروج کا اندراج کرکے آرہی تھی کہ خاموش عاکف سے پوچھا ۔

"کچھ نہیں ـــــ یونہی !" انہوں نے مبہم لہجہ میں کہا ۔

"دیکھئے عاکف مجھ میں ہر اچھی بات سننے اور سہنے کی طاقت ہے ـــــ کہہ ڈالیئے جو کچھ آپ کو پریشان کررہا ہے !" ـــــ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجہ میں کہا ۔

"جب تم سمجھتی ہو تو پوچھ کیوں رہی ہو ؟" ان کے لہجہ کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی ۔

" اوہ ـــــ کہاں اُدھر رش میں جارہی ہو ـــــ ادھر آکر بیٹھو !" انہوں نے جھلاتے ہوئے کہا اور رُکتے ہوئے رکشہ پر میں ان کے ہاتھوں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی ۔

شام کے چھ بج رہے تھے ٹھنڈ اور اندھیرا بڑھ چکا تھا مگر لوگوں کا ہجوم کم نہیں ہوا تھا ـــــ اچانک میری نظر عاکف پر پڑی ـــــ اس سردی میں ایک قمیض اور پتلون میں ایسے بیٹھے تھے گویا گرمیوں کی کوئی سہانی شام ہو ۔

"ارے آپ نے کوئی سویٹر نہیں پہنا ۔ اتنی تو سردی ہے !" ـــــ میں نے

ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اندر کی آگ اتنی تیز ہے کہ باہر کی ٹھنڈک کا اثر نہیں ہو رہا ہے !" ــــ وہ بڑبڑائے۔

"آخر بات کیا ہے جو اوندھی سیدھی ہانکے جا رہے ہیں ؟" ــــ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"ماریا ــــ ناراض نہ ہو ــــ میں بتاؤں گا ــــ ضرور بتاؤں گا !" ــــ انہوں نے میرے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا ــــ پھر آہستہ آہستہ صبح کی تمام باتیں گوش گذار کر دیں۔

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے ؟ اگر پھپھو نہیں چاہتیں تو مت جایئے !" ــــ میں نے رسانیت سے کہا۔

"لک ..... کیا ..... ؟ اور ان کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔

"ہاں عاکف ــــ انسانیت اور محبت کا یہی تقاضہ ہے کہ آپ ان کی بات نہ ٹالیئے" ــــ باوجود کوشش کے میری آواز میں آنسو اُتر آتے تھے۔

"ماریا پلیز ! ــــ میں ویسے ہی پریشان ہوں ــــ تم ــــ تم ــ خدا کے لئے" ــــ اور وہ رک گئے۔

"ماریا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم ــــ یہاں رک جاؤ ــــ پھر کچھ عرصہ بعد ہم پاکستان چلے چلیں گے !" انہوں نے میرے ہاتھ سہلاتے ہوئے خوشامد بھرے لہجے میں کہا ــــ

اور مجھے آگرہ کی وہ مدہوش رات یاد آگئی جب میں بے خودی کے عالم میں اپنی مسہری پر بے سُدھ پڑی تھی اور پھپھو سوتے میں بڑبڑا رہی تھیں۔

"میری بچی ــــ میری روح ــــ میں ــــ کاش میں تیری ــــ خواہش پوری ــــ مگر تارہ کا کیا ــــ مگر تارہ کا کیا ــــ تارہ کا ــــ اب میں کسی کو کسی کے انتظار ..... " اور اس کے بعد ان کی آواز نیند کے سمندر میں ڈوب گئی تھی۔

میں بہت کچھ سمجھ چکی تھی مگر خاموش تھی ــــــ میرے ذہن میں بہت سی باتیں گھوم رہی تھیں ۔

" نہیں ــــــ میں ہندوستان میں نہیں رہ سکتی !" ــــــ میں نے اچانک ہی فیصلہ کن لہجے میں کہا ۔

" تم ــــــ میری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتیں ؟" ــــــ ان کی آواز میں شکوہ تھا ۔

" اس سے زیادہ کر سکتی ہوں ــــــ مگر یہ ناممکن ہے ! پھر ــــــ وعدہ تو آپ نے کیا تھا وہاں چلنے کا !" ــــــ میرے سچے بے ریا جذبوں نے بڑی مشکل سے اندھیرے کا سہارا لے کر سفاکی کا مظاہرہ کیا ۔

" میں کیا کروں ایک طرف خالہ جان ہیں ، ان کی ساری زندگی کی تپسیا اور تیاگ ہے ۔ دوسری طرف تم ہو ــــــ میری زندگی ــــــ میری محبت ــــــ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں ؟" ــــــ انہوں نے پریشانی سے پیشانی ہاتھ سے ملتے ہوئے کہا ــــــ وہ واقعی بہت پریشان تھے ۔

" جو اہم ہو ــــــ اسے چن لیجئے !" ــــــ میں نے بے اعتنائی سے کہا اور وہ بس عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ کر رہ گئے ۔

ٹرین چھوٹنے میں ابھی کچھ دیر تھی ــــــ اسٹیشن پر کلاوتی ، پھپھو اور عاکف مجھے رخصت کرنے آتے تھے ــــــ عاکف کے چہرے پر جیسے دھول سی اڑ رہی تھی ، آنکھوں میں ویرانیاں تھیں ، چہرے پر ایک بے تاثر بے نام جذبہ چھایا ہوا تھا ۔ کلاوتی کی مسکراہٹ میں سنجیدگی تھی اور پھپھو حسبِ عادت اپنی مخصوص محبت کے ساتھ سب کو دعا سلام کہلوا رہی تھیں ۔

" میرا خیال ہے ماریا اب تم ٹرین پر چڑھ جاؤ ــــــ پانچ چھ منٹ رہ گئے ہیں !" ــــــ کلاوتی نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ۔ میں اس سے گلے ملی ــــــ گرم جوشی کا احساس

ہوا ـــــ عاکف سے ہاتھ ملایا ٹھنڈا یخ بے جذبہ سا اجنبی ہاتھ ـــــ اور پھر پھپھو کی باہنوں میں بکھر گئی۔ ہم دونوں ہی رو رہے تھے وہ شاید ـــــ اپنے فیصلہ پر اور میں اپنی شکست پر۔

"بیٹا ـــــ ہو سکے تو اپنی پھپھو کو معاف کر دینا" ـــــ وہ پلیٹ فارم پر ٹرین کی کھڑکی سے لگی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔ میں نے دھندلی آنکھوں سے کچھ دور کھڑے عاکف کو دیکھا ـــــ جو بت بنے آنکھوں میں دنیا جہان کی شکایتیں لئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"میری بچی ـــــ ہم انسان بہت کمزور ہیں" ـــــ ٹرین نے سیٹی دی۔

"تو پہلی بار یہاں آئی اور میں نے ـــــ میں نے تیری خواہش کو اپنے ارمانوں تلے روند دیا ـــــ مگر ـــــ مگر ـــــ" ٹرین رینگ رہی تھی اور وہ ساتھ ساتھ چل رہی تھیں ـــــ

"بیٹا ۳۸ برس پہلے ـــــ ایک شخص نے اپنے مستقبل کی خاطر ـــــ ایک معصوم زندگی کو تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا ـــــ اب میں اس کہانی کو دہرانے نہیں دوں گی ـــــ عاکف یہیں رہے گا ..... اب ..... اب ..... کوئی خاور کسی ..... وجاہت علی ..... کے ..... انتظار ..... میں ..... بھسم نہیں ہو گی ....." میں نے رفتار پکڑتی ٹرین سے جھانکا ـــــ ایسا لگا جیسے ارمانوں، آرزوؤں، خواہشوں کی چتا جل رہی ہو اور زمین سے اٹھنے والے ان شعلوں کی لپک آسمان تک پہنچ رہی ہو!!

۱۹۸۶ء اسلام آباد

قسم اللہ پیارے کی

لان میں پہنچی تو دیکھا وہ سر پکڑے امّی کی کرسی کے پاس زمین پر بیٹھا حسبِ معمول اپنے دکھڑے سنا رہا تھا ــــ آج بہت غصہ میں لگ رہا تھا ــــ بولتے بولتے زبان لڑکھڑانے لگتی تھی۔

" کتنی بار تم سے کہا ہے کہ جب ان کمبختوں کو تمہارا کوئی خیال نہیں تو کیوں سب کے پیچھے جان دیئے مرتے ہو!" ــــ امّی نے کہا۔

" کیا کریں بیگم صاب ــــ بس کاکوں کی وجہ سے ــــ اور پھر آپ کھُد دیکھیں جمانہ کیسا بُرا آن لگا ہے ــــ مہنگائی ہے روج بہ روج عرس سے باتیں کر رہی ہے۔ اب میرا بھی تو کوئی فرج بنتا ہے ــــ بچوں کو دیکھتا ہوں تو دل یوں یوں کرتا ہے!" اس نے دلی کیفیت کا اظہار ہاتھ کے اشاروں سے کیا۔

" کیا بات ہے آج پھر بھائی سے جھگڑا ہو گیا؟" ــــ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

" ہاں باجی ــــ بس آج کے بعد جو اس کے گھر گیا تو قسم اللہ پیارے کی کتّے کی اولاد کہنا ــــ بہت ہوگئی ــــ اب آپ دیکھیں کیسا لمّا تگڑا جوان ہے ــــ مگر بس ہر دم بدماسی کیا کرتا ہے ــــ آنکھوں میں جنانیوں کی طرح سرمہ ڈال، سر میں کھوپرے کا تیل لگا، ریشمی لُنگی پہن کھوسبو میں بسا گنڈوں کی طرح باجاروں میں پھرا

کرتا ہے۔ آج چھوٹا کاکا بیمار تھا ـــــ میں اس کے گھر گیا تو بہو پریشانی میں رو رہی تھی۔۔۔ ابھی میں اسے تسلی دے رہا تھا کہ جانے کہاں سے گھومتا نکل آیا۔ اس کی شکل دیکھ کر میرے تو آگ لگ گئی ـــــ میں نے کہا ـــــ " محمد حسین ـــــ حرامی جرا جورو اور کاکوں کا کھیال بھی رکھا کر!"

" بس باجی اس نے میرے ساتھ بہت بدتمیجی کی ـــــ اِتّی بڑی گالی دی جو میں کھاب میں بھی سوچ نہیں سکتا " ـــــ فضل محمد خاموش ہو گیا۔

" کیا کہہ دیا محمد حسین نے ؟" ـــــ میں نے پوچھا ـــــ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

" باجی بہت بری بات کہی ـــــ کہنے لگا ـــــ کہ ـ کہ ـــ لالہ بڑا کھیال ہے میرے گھر کا اور جنانی کا ـــــ کھسم ہم ہے کہ تم !" ـــــ فضل محمد کی آواز ـــ بھرّا گئی تھی۔

" بس باجی ـــــ گصہ مجھے پاگل کر گیا ـــــ میں نے کس کر ایک دھپڑ اُس کے منہ پر لگایا اور بولا ـــــ اوئے کتّے وہ دن بھول گیا جب کندھے پر چڑھا سارا سہر گھوما کرتا تھا ـــــ بس پھوراً میرے کدموں پر گر گیا اور لگا معافی مانگنے ـــــ فضل محمد رک گیا پھر بولا۔

" باجی وہ دیکھنے میں تو ہے بالکل پہلوان مگر اندر سے کھالی ـ ڈرپوک !" ـــ

" تو تم نے معاف کر دیا ؟" ـــ میں نے پوچھا۔

" نہیں ـــــ ہم اس کو بالکل معاف نہیں کرے گا "

" باجی اس نے ہمیں بہت بڑی گالی دی ہے ـــــ اس کی جنانی کو ہم اپنی بیٹی کی ماقک سمجھتا ہے ـــــ اس کے کاکوں کو اپنی اولاد جانتا ہے ـــــ مگر آج کے بعد ـــ ہم بالکل اس کے گھر نہیں جائیں گے ـــ !" ـــــ یہ کہہ کر وہ اپنے کاندھے پر

پڑے رومال سے آنکھیں پونچھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا

فضل محمد خانساماں پچھلے پچیس برسوں سے ہمارے گھر تھا — ایک بار دادا جان کہیں جارہے تھے تو ٹرین میں یہ ملا تھا بمشکل تمام پندرہ سولہ برس کا رہا ہوگا — اس نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں بتایا کہ خرکار اسے بچپن میں اٹھالے گئے تھے وہیں سے بھاگا ہے — ان لوگوں نے اس کی زبان جگہ جگہ سے داغ دی تھی اسی وجہ سے بولنے میں لکنت تھی — لفظ بھی صحیح طور سے ادا نہیں کر پاتا تھا۔ دادا جان اسے ساتھ لے آئے مہینوں اخبارات میں اشتہار دیتے رہے اور آخر کار ایک دن اس کا باپ، سوتیلی ماں اور سوتیلا بھائی محمد حسین اسے ملنے آگئے — اس کی ماں بیٹے کے غم میں اللہ کو پیاری ہو چکی تھی — بس وہ دن اور آج کا دن فضل محمد نے اس گھر کی چوکھٹ نہیں چھوڑی۔ فضل محمد آج بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہم نے اسے اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ دیانت دار، پرہیز گار اور بے حد محنتی — میری بہنوں کی شادیاں ہوگئیں بھائی پڑھنے چلے گئے اور گھر میں اب فقط ہم تین ہی نفوس رہ گئے تھے امّی پاپا اور میں۔ امّی تو حسبِ معمول شام کو بیٹھ کر کبھی جمعدار کی بیوی کے گھر کے جھگڑے نمٹاتیں کبھی دھوبن کی بہو کے دکھڑے سنتیں — خیر یہ تو کبھی کبھی کے واقعات تھے مگر فضل محمد کا تو ہر دوسرے تیسرے روز یہی معمول تھا بھائی سے کسی نہ کسی بات پر ناراض ہو کر آجاتا — سو باتیں اس کو سناتا، بڑے جوش سے کبھی نہ ملنے کی قسم کھاتا — مگر پھر دیکھو تو تیسرے چوتھے دن ہنستا ہوا، دمکتا چہرہ لئے چلا آرہا ہے۔

"کیوں چاچا — توڑ دی قسم؟" — میں اس کا چہرہ دیکھ کر ہی سمجھ جاتی اور وہ زور سے ہنس پڑتا۔

"کیا کریں باجی — سوتیلا ہے تو کیا ہوا — آخر ہے تو ایک ہی

باپ کا کھون !"

مگر آج وہ واقعی بے حد ناراض تھا ـــــ

"کس قدر کمینہ ہے اس کا بھائی ـــــ ذرا بھی تو شرم نہیں آئی" ـــــ میں نے اس کے جانے کے بعد امی سے کہا۔

"ارے بیٹا جیسی روح ویسے فرشتے۔ ان لوگوں کے ہاں اس قسم کی باتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں ـــــ اور اس کم بخت کو دیکھو ـــــ ہر ماہ ساری تنخواہ بھاوج کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے ـــــ کتنا سمجھایا کہ فضل محمد کچھ تو اپنے لئے رکھ لیا کر ـــــ تو کہتا ہے بیگم صاب ہمارا کون ہے ـــــ نہ بیوی نہ بچے ـــــ نہ ماں نہ باپ، جرورت مند تو بھوا اور بچے ہیں ـــــ امی نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئیں ـــــ اور میں کافی دیر بیٹھی فضل محمد کے بارے میں سوچتی رہی ـــــ آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں جب سگے سگے کا روادار نہیں ـــــ فضل محمد کا کردار واقعی عجیب تھا !

شاید چوتھے روز کا ذکر ہے۔ میں لان میں بیٹھی تھی یکایک گیٹ کھلا اور تین چھوٹے چھوٹے سہمے ہوئے بچوں نے یکے بعد دیگرے جھانکا۔

"ہاں ـــــ کیا بات ہے !" فضل محمد کے بھتیجوں کو پہچان کر میں نے پوچھا۔

"وہ ـــــ باجی ـــــ اماں پوچھ رہی ہے تایا ابو بیمار تو نہیں ہو گیا ـــــ چار پانچ دن سے گھر نہیں آیا ؟" ـــــ ایک نسبتاً بڑے بچے نے ہمت کر کے کہا۔

"نہیں ـــــ بیمار تو نہیں ہے مگر وہ تم لوگوں کے گھر نہیں جائے گا تم سے ناراض ہے !" ـــــ میں نے کہہ کر بچوں کو چلتا کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد فضل محمد جو کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے بولا : "باجی ـــــ کوئی ہماری کھیریت مالوم کرنے تو نہیں آیا ؟" ـــــ یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک کوند گئی ـــــ شاید امید کی ! ـــــ

"کیا کسی کو آنا تھا؟؟" ـــــ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوتے پوچھا۔ اور اس کا چہرہ جیسے بجھ گیا۔

"نن .... نہیں تو ..... بس ویسے ہی پوچھ لیا"ـــــ اس نے سر جھکا کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"وہ محمد حسین کے بچے آئے تھے!" میں نے ایکدم ہی کہا اور فضل محمد جیسے پورا کا پورا جگمگا اٹھا۔

"کک .... کیا .... کب .... کیا کہہ رہے تھے!"ـــ وہ بے تابی سے مڑا۔

پھر میں نے ساری داستان سنا دی۔

"ہاں اچھا کیا ـــ باجی ـــ واکعی میں ہوتا تو کسم ٹوٹ جاتی ـــ کسم اللہ پیارے کی مگر اب ایسا نہیں ہوگا!" ـــ اس کے منہ سے جیسے کراہ نکلی۔

کئی مہینے گزر گئے ـــ فضل محمد پہ واقعی حیرت تھی کہ ایک بار بھی تو نہیں گیا بھائی کے گھر ـــ اور اگر اس کے گھر سے کوئی آجاتا تو کہلوا دیتا کہ گھر پر نہیں ہے ـــ ایک شام گھر پہ کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب لوگ باتوں میں مصروف تھے یکایک شور کی آواز سے ہم چونک پڑے امی اور میں گیٹ کی طرف لپکے۔ عجیب منظر تھا ـــــ محمد حسین فضل محمد کی ٹانگوں کو مضبوطی سے پکڑے زاروقطار رو رہا تھا۔

"لالہ ـــ معاف کر دے ـــ گھر چلا چل ـــ اللہ کے واسطے!" وہ روتے روتے بھائی کی خوشامد کر رہا تھا اور فضل محمد کا غصہ کے مارے برا حال تھا۔

"دفع ہو جا حرامی ـــ جب کہہ دیا کہ تیرے گھر نہیں جانا ہے تو کیوں پریشان کر رہا ہے! ـــ ہم ـ ہم ـــ اللہ پیارے کی کسم یا تیرا کھون کر دے گا یا اپنا ـــ چلا جا محمد سین!"ـــ لفظ غصہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکل رہے تھے اور یہ کہتے کہتے اس نے دو تین گھونسے محمد حسین کے جڑ دیے مگر وہ خاموش پٹتا رہا۔ـــ

"مارے لالہ ــــ جتنا مارنا . . . ہے . . . . مگر. . . . ایک بار گھر چلا چل۔"

محمد حسین نے ایک بار پھر روتے روتے کہا ــ اور فضل محمد نے اس زور سے ٹانگ کو جھٹکا دیا کہ محمد حسین لڑھکتا ہوا ایک طرف جا گرا۔

"ارے فضل محمد چلا جا ــــ معاف کر دے !" ــــ امّی کو رحم آ گیا تھا۔

"نیئں بیگم صاب ــــ اس نے جبان کی تلوار ماری ہے ــــ ہم ــــ بالکل نیئں جائے گا !" ــــ فضل محمد نے غصہ بھرے لہجہ میں کہا۔

"جا تو سہی ــــ دیکھ بچے یاد کر رہے ہوں گے !" ــــ امی نے ایک اور پانسہ پھینکا۔

"بچے ؟ ؟ ــــ وہ بھی اس حرامی کا کھون ہیں !" یہ کہہ کر اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا اور اندر چلا گیا۔

"محمد حسین اس وقت تم چلے جاؤ وہ بہت غصہ میں ہے ــ !" امّی نے اس کے بھائی سے کہا اور وہ سر جھکائے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"ارے فضل محمد کیا ہو گیا ہے تم کو ؟ ؟" ــــ ایک شام پاپا اسے دیکھ کر چونک پڑے۔ آنکھیں حلقوں میں دھنس گئی تھیں۔ رنگ زردی مائل ہو گیا تھا ــــ اور بشرے سے کمزوری صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

"کچھ نیئں صاب وہ جرا بکھار نے دبوچ لیا تھا ــــ اب تو ٹھیک ہوں ــــ بیگم صاب دوا تو دے رہی ہیں !" اس نے حسب عادت ہنس کر کہا۔

"نہیں ــــ لاپروائی مت کرو ــــ کل صبح ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ ــــ میں فون کر دوں گا !" پاپا نے کہا۔

"اچھی بات ہے ــــ صاب !" اس نے کہا اور میز پر سے چائے کے برتن سمیٹنے لگا۔

"ارے گھلا جا رہا ہے بچوں کے مارے ــــ کتنا سمجھایا کہ اب معاف

کر دے بھائی کو مگر اس کی تو ایک ہی رٹ ہے کہ نہیں جاؤں گا، اس نے مجھے گالی دی ہے!"
امّی نے بتایا۔

"ہوں ــــ دیکھو ایک دو روز میں محمد حسین کو بلا کر صلح کروا دوں گا!" ــــ
پاپا نے کہا اور اُٹھ کھڑے ہوتے۔

اچانک ہی ہمارے ہاں مہمان آگئے اور یوں مہمان داری میں ہم لوگ فضل محمد اور محمد حسین کے جھگڑے کو بھول گئے ــــ تقریباً ایک ہفتہ مہمان رہے ــ جس رات انہیں واپس جانا تھا اسی رات کھانے کے بعد میں باورچی خانے میں گئی چائے کا کہنے تو دیکھا فضل محمد آنکھیں موندے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ میں نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا۔

"اُف بے چارہ کس قدر دبلا ہو گیا ہے!"

"چاچا!" ــــ میری آواز پر چونک کر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

"جی باجی!" ــــ میں چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

"تمہاری طبیعت زیادہ خراب معلوم ہو رہی ہے جا کر آرام کرو!" ــ میں نے کہا۔
اور خلافِ معمول وہ خاموشی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا ــــ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ نمایاں تھی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ اس سے کہ آرام کا کہہ دو اور وہ چلا جائے ــ جب تک ہم لوگ جاگتے رہتے وہ باورچی خانے میں بیٹھا رہتا اور جب اُسے یقین ہو جاتا کہ سارا گھر سو گیا ہے تب وہ باورچی خانہ بند کر کے اپنی کوٹھڑی میں جاتا۔

رات خاصی دیر تک جاگنے کی وجہ سے میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ امّی کی آواز پر آنکھ کھلی۔

"آج آفس نہیں جاؤ گی؟" ــ "ایں ... ہاں ... جاؤں گی ذرا دیر سے

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا" ـــــ اور غسلخانے کی طرف چل دی۔

"آج یہ ابھی تک فضل محمد نہیں آیا ـــــ نو بج رہے ہیں !" ـــ امی نے ناشتہ میز پر لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں رات اس کی طبیعت خاصی خراب لگ رہی تھی !" ـــــ میں نے چائے کا ابلتا ہوا پانی کیتلی میں ڈالتے ہوئے امّی کو تفصیل بتائی۔

"اے ہے ـــــ ہم لوگ تو مہمانداری میں پھنس کر اس غریب کو بالکل ہی بھلا بیٹھے !" امّی بولیں۔ پھر انہوں نے چوکیدار کو بلا کر ہدایت دی کہ فضل محمد کو دیکھ آئے ـ ابھی ہم نے ناشتہ شروع ہی کیا تھا کہ چوکیدار بدحواس کھانے کے کمرے میں دوڑتا ہوا گھسا۔

"بیگم صاب ! بیگم صاب .... وہ فضل محمد .... اس کو پتہ نیئں کیا ہوا .... وہ بولتا ای نیئں ....." آن کی آن میں ہم سب اس کی کوٹھڑی میں جمع ہو گئے ـــــ مگر اب وہاں کیا تھا ـــــ روٹھا ہوا فضل محمد اپنے اللہ پیارے کے پاس جا چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا بھائی بھاوج اور بچے روتے بین کرتے آ گئے۔

"ہائے لالہ ـــ میں تو تمہاری بیٹی ہوں ـــــ اپنی بیٹی سے کیوں روٹھ گئے !" ـــــ محمد حسین کی بیوی فضل محمد کے بے جان قدموں سے لپٹی بین کر رہی تھی ـــ

"صاب اجازت ہو تو ..... لالہ ..... کو ..... گھر لے جا .. وَں !" ـــــ محمد حسین نے روتے روتے پاپا سے کہا ـــــ اور انہوں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"دیکھو محمد حسین تمہاری ذرا سی بات نے چاچا کو موت کے منہ میں پہنچا دیا !" میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں .... باجی .... سب .... گل .... تی .... محمد .... سین

کی ہے .... لالہ اس کا کھیال ..... اپنے ..... بیٹے کی ..... طراح رکھتا....
تھا..... اور .... اس نے .... اس .... نے .... کبھی بڑے ..... بھائی
کی اِجّت نیئں کی ..... ہائے لالہ .... اِتّا بیمار پڑے ..... مگر اپنی.......
بیٹی کو..... کھبر بھی نہ کی .... ناراج تو بھائی سے ..... تھے ..... میرا کیا کصور
..... تھا..... ہائے .... ہم تو..... آکھری ..... وکت ..... کوئی
کھدمت بھی نہ کر پائے .... ہائے لالہ .... وہ بُری طرح بین کر رہی تھی ـــــــ

امّی اسے سنبھالے دلاسہ دے رہی تھیں۔

"ہائے میری بیگم صاب ..... اب ہماری جرورتوں .... کا کون .....
کھیال .... رکھے گا ..... دیکھو تو .... لالہ ہم سے ناراج تھا..... مگر.....
مگر.... ساری تن .... کھاہ .... ہر مہینہ پابندی ..... سے میرے .... کو
.... بھجوا دیا کرتا تھا..... ہائے لالہ ..... محمد حسین کی بیوی رو رہی تھی ـــــــ

سسک رہی تھی میری نظر ایکدم ابدی نیند سوتے ہوئے فضل محمد پر پڑی ـــ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ کا احساس ہوا جیسے کہہ رہا ہو:

"کیا کریں باجی ـــ سوتیلا ہے تو کیا ہوا ـــ آکھر ہے تو ایک ہی باپ کا کھون !!

کوئٹہ ۱۹۸۳ء

لکیریں

"دیکھو بی بی ـــــ یہ جو دائرے، تکون، مثلث وغیرہ ہوتے ہیں نا ـــــ یہ درحقیقت وہ نہیں ہوتے جو ان کے نام ہیں ـــــ بلکہ یہ تو صرف لکیر ہوتی ہے چاہے تو دائرہ بنا لو، تکون بنا لو، مثلث بنا لو ـــــ یا کچھ اور!" ـــــ کافی دیر سے وہ سجاد کے اس فلسفہ پر غور کر رہی تھی ـــــ صبح سے کام کر کر کے خاصی تھک چکی تھی۔ اس کے ہوٹل میں آج ملک کے ایک مشہور انگریزی رسالے "ٹرینڈز" کا سیمینار تھا۔ اس کی وجہ سے صبح سے مختلف شعبوں کو ہدایات دیتی رہی۔ ہال جا کر چیک کیا کہ کسی چیز کی کمی نہ رہ گئی ہو۔ پھر اپنے کمرے میں آکر سہ ماہی پی۔ آر رپورٹ بنائی جو ہوٹل کے مالک کو چند یوم تک بھجوانا تھی۔ ابھی رپورٹ ٹائپ ہونے کو دی ہی تھی کہ سجاد آگیا ـــــ سجاد اس اشتہاری کمپنی کا مینجر تھا جہاں سے اس کے ہوٹل والے اشتہارات بنواتے تھے ـــــ اور اس وقت وہ انٹلکچوئل سجاد کے اس فلسفہ پر غور کر رہی تھی ـــــ فون کی گھنٹی بجی اور وہ چونک پڑی۔

"السلام علیکم سیلز!" ریسور اٹھا کر اس نے میکانکی انداز میں کہا۔

"ہاں بھئی ـــــ وہ "ٹرینڈز" والوں کا سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے؟" ـــــ دوسری طرف سے ہوٹل کے جنرل مینجر نے پوچھا۔

"جی ہاں ـــــ آپ بالکل فکر نہ کیجئے!" اس نے کہا اور پھر چند لمحے غور سے ان کی بات سنتی رہی۔

"اچھی بات ہے ___ میں آ رہی ہوں !" ___ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

نورین پچھلے ڈیڑھ برس سے ہوٹل کاسموپولیٹن میں نائب سیلز مینجر کے عہدے پر کام کر رہی تھی ___ یہ ہوٹل ملک کے اچھے اور نامور ہوٹلوں میں شمار ہوتا تھا۔ اسٹاف لکھا پڑھا تھا اور لوگ اچھے گھرانوں ہی سے آتے تھے۔ پھر اسے سب سے بڑا فائدہ ٹرانسپورٹ کا تھا ___ یہی سب سہولیات دیکھ کر اس نے یہ نوکری قبول کی تھی۔

وہ جنرل مینجر کے کمرے سے نکل کر ابھی لابی میں پہنچی ہی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی۔

"ہے میڈم !" ___ مگر وہ ان سنی کر گئی ___ دوسری بار پھر کسی نے پکارا۔

"ارے محترمہ کہاں چلی جا رہی ہیں ___ ذرا رکیئے تو !" ___ اور وہ مجبوراً رک گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک اخبار کا رپورٹر تھا۔

"اوہ ! ___ نوید صاحب آپ یہاں کیسے ؟" اس نے خوش خلقی سے پوچھا۔

"بس یہی "ٹرینڈز" کے سیمینار کی کوریج کے لئے آیا تھا۔

"تم کہاں ہو آج کل ؟" نوید نے قریب آکر بے تکلفی سے پوچھا۔

"بھئی آپ نے ناحق اپنے گلے کو تکلیف دی ___ میرے قریب آکر بھی تو گفتگو کر سکتے تھے !" اس نے چند لمحے قبل نوید کی بدتہذیبی کا احساس دلانے کو بظاہر مسکرا کر کہا۔

"تمہارا نام بھول گیا تھا مگر چہرہ یاد رہا ___ ہاں تو میں پوچھ رہا تھا آجکل کہاں ہو ؟" نوید نے بغیر کسی شرمندگی کے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"نظر نہیں آ رہی ہوں کہ کہاں ہوں ؟" اس نے پوچھا۔

"اوہ ___ تو تم اس ہوٹل میں کام کر رہی ہو ؟ نوید نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

"ہاں؟"—— نورین نے مختصراً کہا۔
"بہ حیثیت؟؟"—— اس نے کریدا
"بہ حیثیت نائب سیلز منیجر"—— نورین نے بتایا
"ارے واہ! —— پھر تو بڑے ٹھاٹ ہوں گے —— یہاں تو سنا ہے تنخواہ بھی بہت اچھی ہے اور پھر سہولیات بھی کافی ہیں —— ایک ہم ہیں دن بھر خوار ہوتے رہتے ہیں"—— نوید نے منہ بنا کر کہا۔

"ایسا ہے تو آپ میری منیجری لے لیجئے اور میں آپ کی خواری!"—— وہ ہنس پڑی۔

"ایسا ہو سکتا تو کیا بات تھی —— ویسے تم بالکل ویسی ہو۔ جیسا کہ دو برس پہلے لاہور میں دیکھا تھا جب تم اخبار کی کوریج کے لئے آئی تھیں!"—— نوید نے بے تکلفی سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"KEEP YOUR HANDS OFF NAVEED SAHIB!
میں اس قسم کی بے تکلفی پسند کرتی ہوں اور نہ عادی ہوں!"—— اس نے تیز لہجہ میں کہا —— غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور نوید نے کھسیا کر ہاتھ ہٹا لیئے۔
"وہ دراصل ...... بات یہ ہے ..... کہ .... نوید نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اَن سنی کرتی ہوئی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

ہوٹل میں آنے سے قبل اس نے تقریباً ایک سال تک اخبار میں نوکری کی تھی لیکن آنے جانے کی دِقّت کی وجہ سے یہ نوکری اسے ترک کرنا پڑی تھی اخبار کی نوکری اسے پسند تھی اور یہی وجہ تھی کہ اخبار سے متعلق ایک اچھے خاصے بڑے حلقے سے اس کی جان پہچان تھی۔

کمرے میں آ کر وہ دو گلاس ٹھنڈا پانی ایک سانس میں چڑھا گئی مگر غصہ ہنوز قائم تھا۔

چند لمحے اپنے مختصر سے کمرے میں پھرتی رہی، میز پر رکھے رسالے خواہ مخواہ الٹ پلٹ کیئے ___ ایک طرف کینٹ پر رکھے ہوٹل کے بروشرز کو نئی ترتیب دے ڈالی ___ اور پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ اچانک اسے اپنی پی۔ آر رپورٹ کا خیال آ گیا ___ اس نے فون اٹھا کر ٹائپسٹ کا نمبر گھمایا۔

"ہاں اکبر ___ رپورٹ ٹائپ ہو گئی ہو تو اسے لے آنا"۔ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ابھی وہ رپورٹ پڑھ ہی رہی تھی کہ "ٹرینڈز" کے نائب مدیر فراست عدیم داخل ہوئے۔ نکھری شخصیت کے ادھیڑ عمر کے اس خوش اخلاق آدمی کا وہ واقعی احترام کرتی تھی۔

"آیئے عدیم صاحب ___ کب شروع گا آپ کا سیمینار؟" ___ اس نے آنے والے کی پذیرائی کرتے ہوئے پوچھا۔

"بس دو بجے شروع ہو جائے گا!" ___ فراست عدیم کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"کافی بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے یہ سیمینار؟" ___ اس نے رپورٹ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ___ پورے ملک کے مختلف اخبارات اور رسائل سے متعلق لوگ آئیں گے ___ کچھ یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات بھی شامل ہیں!" ___ انہوں نے تفصیل بتائی۔

"اچ ___ چھا ___ چائے پیجئے گا؟" نورین نے پوچھا۔

"چائے؟" ___ انہوں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں پلا دو ___ ابھی تو ایک گھنٹہ باقی ہے!" ان کے اقرار کے ساتھ ہی نورین نے روم سروس کو فون کر کے چائے کا کہہ دیا۔

"اچھا سنو نورین ـــــ پرسوں ہمارا سیمینار ختم ہو جائے گا ـــــ پھر ڈنر پہ آنا ضرور!" فراست عدیم نے ایک کارڈ، بریف کیس سے نکال کر دیتے ہوئے تاکید کی۔

"اچ ـــ چھا!" اس نے مبہم لہجہ میں کہا۔

"کیابات ہے ـــ بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان سی ہو؟" وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

"نن ـــ نہیں ـــ تو ـ بس ـــ ایسے ہی!" ـــ اس نے رکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو نورین ہم تم دوست ہیں نا؟" ـــ انہوں نے پوچھا ـــ نورین نے بغور ایک لمحہ کو ان کے ستھرے وجود کو دیکھا۔

"جی ہاں بالکل!" ـــ وہ بولی۔

"تو پھر ـــ دوست کو پریشانی نہیں بتاؤ گی؟" ـــ ان کے نرم لہجہ نے نورین کی ہمت بڑھائی۔

"پریشانی تو کوئی نہیں ـــ بس غصہ چڑھ گیا تھا ـــ بلکہ یوں کہیئے کہ دکھ کا شدید احساس" ـــ اور اس جملے کے ساتھ ہی تھوڑی دیر پہلے کا واقعہ گوش گزار کر دیا۔

"بات یہ ہے نورین کہ ہمارے ہاں کی عورت اتنی پابند نہیں ہے جتنا کہ مرد ـــ یعنی یوں سمجھو کہ ہم بنیادی طور پر گھٹن میں جی رہے ہیں۔ سسک سسک کر ـــ اور ایسے میں، اس معاشرے کے مرد کے نزدیک ایک عورت کو صرف دیکھ لینا ہی بہت بڑی بات ہے چہ جائیکہ کوئی لڑکی مسکرا کر بات کر لے ـــ اور یہ مسکراہٹ بے شک کاروباری ہی کیوں نہ ہو، مرد کو عشق میں مبتلا کر دیتی ہے ـــ دراصل یہ سب سوشل سیٹ اپ اور شکست دریخت کا شکار سوشل سٹرکچر کا المیہ ہے ـــ مگر معاف کرنا اس میں کچھ قصور ہماری عورت کا بھی ہے۔ یعنی مرد کے اس عاشقانہ رویے کی ذمہ دار کسی حد تک عورت بھی ہے۔

ہمارے ہاں کی لڑکیاں ذہنی طور پر ایک ایسے تخیلاتی ماحول میں رہتی ہیں جہاں انہیں صرف

ایک شاہزادے کا انتظار رہتا ہے ـــــ بلکہ یوں کہہ لو ہماری عورت چاہے وہ اعلیٰ سوسائٹی کی ہو یا ادنیٰ کی وہ پنگھٹ پر کھڑی کھڑی زندگی بتا دیتی ہے ـــــ وہ بیگم بننا چاہتی ہے ـ فیوڈلزم اس کا آئیڈیل ہے ـــ وہ کسی طور ٹیلنٹ کو PATRONIZE کرنے کو تیار نہیں ـــ اور اسی ٹکراؤ سے اس قسم کے حالات پیدا ہوتے ہیں ـــ جو بے حد غیر یقینی اور تباہ کن ہیں !" ـــــ فراست عدیم اپنی طویل تقریر کے بعد خاموش ہو گئے ـ

"میں آپ کے نظریات سے اتفاق نہیں کرتی کیونکہ ایک طرف آپ عورت کو ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں دوسری طرف مرد کے مسائل کا ذمہ دار بھی عورت ہی کو گردان رہے ہیں ـــ میں سمجھتی ہوں کہ ہمارے ہاں کا مرد اپنے آپ کو کسی دیومالائی کردار سے کم نہیں سمجھتا ـ اس کے نزدیک دنیا کی ہر عورت چاہے وہ کسی شہر کی ہو، کسی خانوادے کی ہو ایک سہل الحصول چیز ہے ـ حالانکہ درحقیقت ایسا نہیں ہے ـــ ہمارے ہاں کے لڑکے عموماً خواتین پر اس وقت EXPOSE ہوتے ہیں جب عمر کا ایک طویل حصہ تعلیم، نوکری ـــ وغیرہ میں گزار دیتے ہیں ـــ میرے خیال میں عدیم صاحب آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ـــ پھر ـــ آپ بھی تو اس ٹوٹتے بکھرتے معاشرے کے فرد ہیں ـــ آپ بھی تو ایک مرد ہیں ـــ مگر آپ ان سب سے بے حد مختلف ہیں !" اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا ـــ فراست عدیم کے چہرے پر تفاخر کی سرخی جھلک آئی تھی ـ

"بھئی نورین ہر آدمی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے ـــ اب تم کو ایک واقعہ سناؤں ـــ چند برس پہلے صحافیوں کا ایک وفد ایک غیر ملکی دورے پر گیا ـــ مجھ سمیت تقریباً پندرہ جرنلسٹ تھے ـ اتفاق سے ہماری گائیڈ ایک خوبصورت نوجوان لڑکی تھی ـ وہ مختلف شہروں میں ہماری ہمرکاب رہی ـــ ہمارے جرنلسٹ حضرات انفارمیشن سے زیادہ دلچسپی اس لڑکی میں لے رہے تھے ـــ فضول سوالات کر رہے تھے ـــ بے تکی باتیں کر رہے تھے ـ میں دیکھ رہا تھا ـــ لڑکی کبھی کبھی خاصی پریشان

ہو جاتی تھی — مگر میں بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا — سو خاموش رہا — بلکہ اکثر تو یوں بھی ہوا کہ وہ دوسرے حضرات کی باتوں سے گھبرا کر مجھ سے گفتگو کرنے لگتی — جس روز ہمیں صبح واپس آنا تھا اس رات کا واقعہ سناؤں — ہم سب ڈنر کے بعد ہوٹل کی لابی میں بکھرے بیٹھے تھے کہ وہ آگئی اور سیدھی میرے برابر والے صوفے پر بیٹھ گئی اور بولی: —

"مسٹر عدیم آپ اس وقت فارغ ہیں!" — میں چونک پڑا اور کہا: —

"ہاں — کیوں؟" — کہنے لگی آپ اگر اس وقت میرے فلیٹ پر چل کر ایک پیالی کافی پی لیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ میں نے چند لمحے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا — اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلنے لگی تمام حضرات ہمیں رقیبانہ نظروں سے گھورنے لگے — مگر تم کو تو پتہ ہے ویسٹ کی لڑکیاں کس قدر نڈر ہوتی ہیں۔ یقین کرو نورین میں اس کے فلیٹ پر تقریباً چار گھنٹے رہا۔ ہم دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے — وہ مجھے اپنے بارے میں بتاتی رہی اور ...... اور نورین کو اچانک سجاد کا فلسفہ سمجھ میں آگیا۔

"یہ جو دائرے، تکون، مثلث وغیرہ ہوتے ہیں نا در حقیقت یہ وہ نہیں ہوتے جو نظر آتے ہیں بلکہ یہ تو لکیر ہوتی ہے چاہے تو دائرہ بنا لو — تکون بنا لو، مثلث بنا لو۔ یا کچھ اور!!

اسلام آباد ۱۹۸۵ء

ڈبل ہے!

عصمی کو کراچی کے بارے میں صرف اتنا یاد تھا کہ ناظم آباد کے کسی علاقے میں بہت سارے مکانوں کے بیچ ایک چھوٹا سا دو کمروں کا مکان جس میں ایک صاف ستھرا صحن تھا اور وہ اس صحن میں دن بھر دوڑ لگایا کرتی تھی ـــــ کراچی کی یادوں کا کل سرمایہ یہی ایک ہلکی سی شبیہہ تھی ـــــ اس کے بابا کو پنجاب کا علاقہ بے حد پسند تھا اور یہی وجہ تھی جب وہ صرف چار برس کی تھی تو بابا پنجاب میں آباد ہو گئے ـــــ اور اب تقریباً بائیس تیئس برسوں بعد وہ اپنی خالہ کے گھر شادی کے بعد پہلی بار کراچی آئی تھی۔ کتنا شوق تھا اسے کراچی دیکھنے کا ـــــ کتنی باتیں سن رکھی تھیں اس نے کراچی کے بارے میں مگر بس کبھی موقع ہی نہ ملا ادھر آنے کا۔ جو عزیز رشتہ دار تھے سب ہی کی اپنی مصروفیات تھیں ـــــ وہ دو ہفتہ سے کراچی میں تھی اور شہر کا چپہ چپہ گھوم چکی تھی ـــــ اس وقت بھی بستر پہ لیٹی شہر کی رنگینیوں میں گم تھی کہ اپنی خالہ زاد بہن رانی کی آواز پر چونک پڑی۔

”آپی ـــــ میں ذرا بازار تک جا رہی ہوں چلیئے گا؟“ ـــــ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”چلو ـــــ مگر گاڑی تو خالو جان لے گئے ہیں؟“ ـــــ اس نے کہا۔

”ارے واہ! ـــــ ہم کراچی والے بہت تیز ہوتے ہیں ـــــ یہاں تو بچہ بچہ بسوں اور منی بسوں پہ سفر کرتا ہے ـــــ ویسے تو میں بازار تک پیدل

بھی جا سکتی ہوں۔ مگر آیئے آپ کو کراچی کی بسوں کی سیر کرا دوں بس ایک سٹاپ کے فاصلے پر منزل ہے!" ــــ رانی نے دعوت دیتے ہوئے کہا۔

" اللہ نہیں ــ بس تو بہت بھری ہوتی ہے! " عصمی گھبرا کر بولی۔

" جناب بھری بھی وہ میرے آپ کے جیسے انسانوں سے ہوتی ہے پھر ہمارے ہاں یا تو دو ٹانگوں پر سفر کیا جاتا ہے یا پھر بس پر اور اگر زیادہ عیاشی سوجھی تو منی بس پر ــــ چلئے آج آپ کو عیاشی کرا دیں ــ یعنی منی بس پہ لے چلیں!" ــ رانی اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہوئی بولی

" اچھا ــــ چلو!" ــــ عصمی تیار ہو گئی۔

وہ کافی دیر سے سٹاپ پہ کھڑی تھیں ــــــ بسوں کا یہ حال تھا کہ انہیں دیکھ کر ہی عصمی کا دم الٹنے لگتا تھا اسقدر کھچا کھچ بھری ہوتی تھیں۔ منی بسیں آ تو رہی تھیں مگر ان کا بھی وہی عالم تھا ــــــ اچانک ایک منی بس آ کر رُکی سیٹ خالی دیکھ کر رانی لپک کر آگے آتی۔ پہلے رانی بیٹھی پھر عصمی، عصمی نے گردن موڑ کر پیچھے کو دیکھا ٹکٹ لینے والا لڑکا بدمعاشی سے مسکرا کر زور سے بولا: ڈبل ہے! " عصمی ایکدم گھبرا کر سامنے دیکھنے لگی۔ سٹاپ پر بس رکی رانی نے عصمی کو ٹھوکا دیا۔

" کہاں کھوئی ہوئی ہیں اُتریئے!" ــــ اور وہ چونک کر اُتر گئی۔ وہ دونوں اتر کر نیچے کھڑی ہو گئیں ٹکٹ لینے والا لڑکا اندر منہ کئے ڈرائیور سے کچھ بات کر رہا تھا ایکدم دروازے پر لٹک سا گیا اور لفنگے پن سے ہنس کر زور سے بولا " ڈبل ہے!" عصمی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے چور نظروں سے اپنے ہلکے سے ابھرتے ہوئے ہیٹ کو دیکھا۔

" واقعی کراچی والے بڑے تیز ہوتے ہیں ــــ ابھی تو کوئی واضح آثار بھی نہیں پھر بھی پتہ نہیں کیسے کم بخت کو پتہ چل گیا!!"

کراچی ۱۹۷۹ء

خانقاہ

"مہذب دنیا کے تہذیبی رویے اور مذاہب میں پلنے والے لوگ درحقیقت اندھیری خانقاہوں کی پروردہ ذہنیتیں ہیں۔ جہاں اجالے کی کرن گھور اندھیرے کے پیٹ میں بے بسی سے اُتر جاتی ہے جب جب مذہب اور تہذیب کے نام پر انسان انسان سے جدا ہوا تب تب میرے اندر ان چیزوں کے لئے نفرت کی لہریں بیدار ہوئیں۔ شاید اسی لئے نہ مجھے مذہب پر اعتقاد ہے اور نہ ہی نام نہاد تہذیب کو مانتی ہوں۔ ہاں صرف ایک چیز میرے وجود کا حصہ لگتی ہے ــــ اور وہ ہے انسانیت ــــ وہی انسانیت جو مذہب اور تہذیب کے شکنجے میں دبی تڑپنے کے باوجود باوقار ہے ــــ روشن ہے ــــ راہنما ہے!"

تالیوں کی گونج میں میں اسٹیج سے اُتری تو میرے کلاس فیلوز اور دوستوں نے گھیر لیا ــــ "ویری ریڈیکل!" ــــ امجد نے تعریفی لہجے میں کہا۔

"آپ کے خیالات اتنے انتہا پسند کیوں ہیں؟" ــــ ایک اور لڑکا داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"لوہا لوہے کو کاٹتا ہے!" ــــ میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"لاحول ولا" ــــ نہ جانے یہ لڑکیاں کیا سمجھنے لگی ہیں اپنے آپ کو!" ــــ اس کی بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے میں دوسری طرف متوجہ ہو گئی۔

تقریباً چار بجے کیمپس سے تھکی ہاری ہاسٹل پہنچی ــــ سارا وقت تقریری مقابلے ہی

کی نذر ہو گیا تھا ___ کمرہ کھول کر قدم رکھا ہی تھا کہ زمین پر پڑے ہوئے ایک لفافے کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھی ___ احسن کا خط تھا ___ میں نے فائل ایک طرف پٹخی اور بے تابی سے لفافہ کھول کر خط پڑھنے لگی ___ جوں جوں خط پڑھتی جا رہی تھی ایک نئی تازگی، ایک انہونی سی خوشی کا احساس میرے رگ و پے میں تریاق بن کر اُترتا محسوس ہو رہا تھا ___ وہ ایک لڑکی کی محبت میں گرفتار تھا! ___ دنیا کے سب خوبصورت جذبے سے ہم کنار ہوا تھا ___ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیسے اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں اور اس کے لمبے چوڑے وجیہہ وجود کو اپنی بانہوں میں بھر کر خوب پیار کروں۔ ساری دنیا کو بتاؤں کہ دیکھو ___ میرا ماں جایا ___ میرا بھائی ___ میرا دوست بھی محبت کرنا جانتا ہے ___ وہ بھی کسی کے جذبوں کا امین ہے، کائنات کا حسن اس کی آنکھوں میں بھی ایک خوبصورت پیکر کے روپ میں اُتر آیا ہے!

"کیا بات ہے آج بہت چہک رہی ہو؟" دوسرے دن شام میں فون پر بابا سے بات کر رہی تھی کہ انہوں نے پوچھا۔

"ہاں ___ میں بہت خوش ہوں ___ بہت دنوں بعد احسن کا خط آیا ہے!" میں نے کہا۔

"ہوں ___ تین چار روز پہلے میرے پاس بھی اس کا خط آیا تھا" ان کے لہجے کو میں نے مسکراتے سنا۔

"اچھا؟ ___ کیا لکھا ہے؟" میں بے تابی سے پوچھا۔

"بھئی کیا بتاؤں کیا لکھا ہے ___ اور جو لکھا ہے وہ پڑھ کر تمہاری امی سخت چراغ پا ہیں ___ سارے گھر کو سر پہ اٹھایا ہوا ہے ___ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں لکھی اس نے!" بابا نے ہلکے سے ہنس کر کہا۔

"بابا ___ پلیز ___ بتائیے نا!" ___ میں نے ضد کی۔

" جو کچھ تمہیں لکھا ہے ___ اسی کی تکمیل کی اجازت مانگی ہے !" ___ انہوں نے کہا۔
" تت ..... تت ...... تو ...... " میں ہکلا گئی۔
" تو کیا ؟ ___ بھئی زندگی اسے گزارنا ہے ___ میں نے لکھ دیا کہ تمہاری پسند ہماری پسند ہے ___ لڑکی کو یہاں لے آؤ ___ مسلمان کر کے شادی کر لو !" ___ بابا کی آواز میں خوشی تھی۔

" ان کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے" ___ سنا تم نے ؟ ___ کل شام سب کو چائینز لے کر گئے تھے جب میں نے وجہ پوچھی تو بولے : " میرا لونڈا کوئی بدھو ہے ___ ارے اس نے محبت کی ہے محبت ! ___ اور اسی محبت کو CELEBRATE کرنے سب کو لایا ہوں !" ___ امّی نے ریسور چھین کر ساری رام کہانی ایک سانس میں کہہ سنائی۔

" اوہ ___ تو امّی ___ اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے ؟ ___ شادی تو اسے کرنا ہی ہے ___ اگر اس کی پسند سے ہو جائے تو کیا بُرا ؟" ___ میں نے ہنس کر امی کا غصہ کم کرنا چاہا۔

" اچھا ؟؟ ___ اچھی محبت ہے ___ یہاں پاکستان میں لڑکیوں کا کال تھا جو ایک غیر ملکی، غیر مذہب کی ...... "

" امی ___ محبت مذہب، علاقے دیکھ کر نہیں ہوتی !" ___ میں نے نرم لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔

" پھر امی ___ یہ بھی تو دیکھتے کہ وہ آپ کا کتنا فرماں بردار بیٹا ہے ___ اس نے ہمیشہ آپ لوگوں کی مرضی کی۔ آپ نے جو کہا بغیر سوال کئے اس پر عمل کیا، زندگی میں پہلی بار وہ اپنی مرضی، اپنی خواہش چاہ رہا ہے تو آپ ..... شدتِ جذبات سے میرا گلا رندھ گیا۔

" اچھا زیادہ بکواس مت کرو ___ تم باپ بیٹی کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے !"

امی ایک دم ہی ہنس پڑیں۔ بیٹے کی محبت نے انہیں چند لمحے قبل کی اصول پرست خاندان پرور عورت سے پھر وہی محبت کرنے والی ماں بنا دیا ــــ جو اولاد کی خوشی کی خاطر سب کچھ تج دیتی ہے ــــ اور میں بھی ماں کے اس رویّے سے کھل اٹھی۔ پھر احسن کے خطوط کے ساتھ ساتھ ٹسی (TESSY) کے خط بھی آنے لگے ــــ میں اس کے خط پڑھتی تو لگتا کہ دنیا کی ساری لڑکیوں کی سوچ کا محور ایک ہی ہوتا ہے۔ ان کے جذبے یکساں ہوتے ہیں۔ ان کی خواہشات ایک دوسرے سے کس قدر ہم آہنگ ہوتی ہیں۔

وہ لکھتی ــــ "احسن اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں رکھتا ــــ میں دوسرے شہر میں رہتی ہوں ــــ روزانہ اسے فون کر کے تاکید کرتی ہوں ــــ مگر ہمیشہ لاپرواہی کر جاتا ہے ــــ تم بھی اس کو لکھنا ــــ وہ بہت محبت کرنے والا انسان ہے۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ جب وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے تو تم سے کتنی کرتا ہو گا!"

ایک بار اس نے لکھا ــــ "میں پاکستانی رسم و رواج کے بارے میں سب کچھ جان گئی ہوں ــــ احسن نے مجھے ایک ایک بات بتا دی ہے ــــ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب میں اجنبی نہیں، تم لوگوں ہی میں سے ایک ہوں ــــ وہ تمہارے خط ترجمہ کر کے سناتا ہے جو تم اُسے لکھتی ہو اور میں حیران ہوتی ہوں کہ تم لوگ کیسے ہو جو صرف محبت کرنا جانتے ہو!"

اس کا ہر خط، ہر تذکرہ احسن کے گرد ہی گھومتا تھا، ایک بار اس نے لکھا:

"میں سمجھتی تھی کہ لڑکیاں ہی جذبوں کو سمجھ سکتی ہیں، محبتوں کو جانچ سکتی ہیں۔ اسی لیے وہی جذبے کی قدر کر سکتی ہیں ــــ مگر اب پتہ چلا کہ احسن جیسے تمام مرد جذبوں کی شناخت میں اوّل ہوتے ہیں۔ ہم دونوں تمہارے بارے میں بہت باتیں کرتے ہیں ــــ اس نے بتایا ہے کہ تم رائٹر ہو۔ میں نے زندگی میں کسی رائٹر کو نہیں دیکھا ــــ ایک بار چلی آؤ پھر ہم تینوں سارا امریکہ گھومیں گے ــــ میں تمہیں وہ تمام جگہیں دکھاؤں گی جہاں میں اور احسن گھومتے رہے ہیں۔ اس مقدس مقام پر بھی لیجاؤں گی جہاں میں اور احسن پہلی بار ملے تھے۔ اور حقیقت

تو یہ ہے کہ احسن ہی نے مجھے محبت کرنا سکھائی ہے!"

خطوط کے ساتھ ساتھ ٹیسی اکثر اپنی تصویریں بھی بھیجتی۔ معمولی نین نقش، بوٹے سے قد، سنہرے بالوں والی ٹیسی مجھے بالکل پاکستانی لگتی تھی ــــ میں کتنی کتنی دیر اس کی تصویر دیکھتی رہتی اسے مبارک باد دیتی کہ وہ دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہے جسے میرے بھائی نے ــــ ایک مرد نے دل کی گہرائیوں سے چاہا ــــ ایک نئی زندگی کا اشارہ دیا ــــ ایک انوکھے جذبے سے ہم کنار کیا۔

ایک روز اس کا بہت طویل خط آیا جس میں اس نے اپنے خاندان کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ اس نے لکھا "ہم لوگ اصل میں یونانی ہیں ــــ کٹر قسم کے رومن کیتھولک، ہماری اپنی مذہبی اور معاشرتی روایات ہیں ــــ ہمارے ہاں شادیاں عموماً ماں باپ کی مرضی سے ہوتی ہیں ــــ وہ اس طرح کہ ماں باپ اپنی پسند کے خاندان کے کسی لڑکے کو لڑکی سے ملوا دیتے ہیں ــــ وہ دونوں کچھ عرصہ ایک دوسرے کو پرکھتے ہیں۔ پھر ایک دن شادی ہو جاتی ہے۔ یعنی لڑکی کا اختیار بس یہ ہے کہ وہ ماں باپ کی پسند کو اپنی پسند بنا لے۔ احسن کو ابھی تک میرے والدین میرا دوست ہی سمجھ رہے ہیں ــــ اور اس معاملہ کا علم صرف میری بڑی بہن کو ہے ــــ وہ بھی اکثر اپنے خدشات کا اظہار کرتی رہتی ہے کہ میرے والدین شاید اس امر کے لئے تیار نہ ہوں ــــ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ دعا کرنا کہ خدا احسن کو کسی دکھ سے آشنا نہ کرے۔ وہ نہ صرف ایک محبت کرنے والا مرد ہے بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا انسان بھی ہے!"

اسی خط و کتابت میں ایک برس بیت گیا۔ اب اس کی بے شمار تصاویر میرے پاس تھیں۔ کہیں وہ اکیلی کھڑی ہے، کہیں احسن کے ساتھ، کہیں لیب میں کام کرتے ہوئے کہیں بے تحاشہ ہنستے ہوئے۔ کہیں خاموش بیٹھی ہے ــــ اور مجھے یہ خاموش تصویریں بڑی قوس و قزح رنگ کہانیاں سناتیں۔ جن کی حدّت میں اپنے اندر کہیں محسوس کرتی۔

میرا فائنل ایئر کا آخری پرچہ تھا اسی کی تیاری میں مصروف تھی ـــــ یہ ٹروتن یما میرے کمرے میں آ کر میرے نام کا ایک خط دے گئی ـــ یہ احسن کا خط تھا ـــــ دو تین ماہ بعد اس کا خط آیا تھا ـــــ اس کے بھی امتحانات ہو رہے تھے۔ میں جیسے جیسے خط پڑھتی جا رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے میری جان آہستہ آہستہ جسم سے علیحدہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ "محبت کے اس نرم و نازک بندھن کو جس میں ٹیسی اور احسن بندھے تھے، مذہب کی تلوار نے بری طرح کاٹ دیا تھا۔" اصل میں صہبا ـــ وہ کٹر کیتھولک ہے ـــــ وہ کسی طور مذہب بدلنے کو تیار نہیں وہ کہتی ہے تم کیتھولک کیوں نہیں ہو جاتے ـــــ اب تم ہی بتاؤ بھلا ایسا کیسے ممکن ہے ؟" ـــــ احسن کے خط کی آخری سطور جیسے میرے ذہن پر، دل پر ہتھوڑے برسا رہی تھیں ـــ میں نے زندگی میں پہلی بار انسان کی ازلی بے بسی کو رگ رگ میں محسوس کیا۔ احسن کا خط آتے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا مگر میں نے جواب نہیں لکھا ـــــ میں لکھتی بھی کیا ؟ میرے پاس لکھنے کو تھا بھی کیا ؟

پھر مجھے ٹیسی کا آخری خط ملا۔ کرب اور دکھ سے بھرا ہوا ـــــ

"سنو صہبا ـــــ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس کو کوئی دکھ پہنچے مگر میں جانتی تھی کہ ہو گا یہی ـــــ جب میری بہن نے ڈرتے ڈرتے میرے ماں باپ سے ہم دونوں کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا: "ہاں ـــ احسن بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہمیں بہت پسند ہے اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ٹیسی اس کے ساتھ بے حد خوش رہے گی ـــــ لیکن ہماری صرف ایک شرط ہے کہ وہ رومن کیتھولک مذہب اختیار کر لے ـــــ اور پھر ـــ صہبا ـــ باوجود ہم سب بہن بھائیوں کے دلائل کے، کوششوں کے ـــ مذہب جیت گیا ـــ محبت ہار گئی ـــــ جذبے ختم ہو گئے امنگیں مر گئیں ـــ مجھے بچپن سے مذہب کی جو تعلیم ملی اس سے تو یہ پتہ چلتا تھا کہ مذہب ہی وہ واحد چیز ہے جو ہر آڑے وقت میں انسان کا سہارا ہے ـــــ انسان کو مصائب و آلام میں مذہب ہی صرف

سکون دے سکتا ہے مگر اب مجھے پتہ چل رہا ہے کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے ــــ مذہب انسانی جذبات، بے ضرر اور معصوم خواہشات کے قتلِ عام کا نام ہے ــــ انسان کو انسان سے چھڑانا ہو تو مذہب ہی وہ واحد چیز ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہے! میں جانتی ہوں احسن مردہے بہت جلد دنیا میں بہل جائے گا ــــ مروں گی تو میں بھی نہیں ــــ لیکن اب آنے والی زندگی کا ہر لمحہ موت سے بدتر ہو گا ــــ میری روح کے سکون کے لئے دعا کرنا ــــ کیونکہ تم تو صرف محبت کرنا جانتی ہو ــــ"

تمہاری ٹیبی ــــ

احسن نے تعلیم کی تکمیل کے بعد وہیں سروس کر لی تھی ــــ پورے چار برس بعد وہ پاکستان آ رہا تھا ــــ دو ماہ بعد اس کی شادی تھی۔

"کیا بات ہے احسن ــــ بہت دبلے ہو گئے ہو!" ــــ ایک رات وہ میرے کمرے میں تھا کہ میں نے پوچھا۔

"ہوں ــــ نہیں تو ــــ وزن کافی بڑھ گیا تھا ــــ اب ٹھیک ہے!" ــــ وہ میری مسہری پر دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"چند ماہ پہلے جو تم نے اپنی تصویر بھیجی تھی اس میں تو پنجابی فلم کے ہیرو لگ رہے تھے!" ــــ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ــــ اس کے بعد کچھ بیمار رہا ــــ کچھ کام کا دباؤ ــــ!" ـ مجھے اس کی آواز میں عجیب سی بے حسی کا احساس ہوا۔

"ایک بات پوچھوں؟" ــــ کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

"ہاں ــــ پوچھو!" ــــ اس کے لہجہ میں ہلکی سی حیرت تھی۔

"جب سے تم آئے ہو ایک خیال ذہن پر سوار ہے ــــ مگر شادی کے

ہنگامے میں موقع ہی نہیں ملا کہ پوچھتی"۔۔۔۔۔۔ میں نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا ــــ جہاں ایک سایہ سا آکر گزر گیا تھا۔

"مجھے معلوم تھا ــــ اسی لئے آج ادھر آ گیا!" ــــ وہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا ــــ

"کافی پیوگے؟" ــــ میں نے تھرماس اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ــــ دے دو!" وہ خاموش ہو گیا۔

"وہ ٹیسی آجکل کہاں ہے؟" ــــ کافی دینے کے بعد میں نے پوچھا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا ــــ ہم دونوں ہی خاموش تھے میرے پاس شاید کچھ اور پوچھنے کا حوصلہ ختم ہو گیا تھا ــــ اور اس کے پاس یقیناً کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔ میں بالکل خالی الذہن بیٹھی اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ کافی دیر بعد اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا ــــ اس کی آنکھیں کسی اندرونی کرب سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"صہبا ــــ وہ مر گئی!" ــــ اور یہ چند الفاظ جیسے میرے پورے وجود کو ہلا کر رکھ گئے۔ کافی کا مگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا مسہری کی سفید چادر پر انمٹ بدنما نشان بناتا ہوا قالین پر لڑھک گیا ــــ "مگ ..... کیا ..... کیسے ..... مر گئی ..... احسن ..... تم نے تو ....." اور میں اپنی جگہ ساکت ہو گئی پتھر کی بن گئی۔

احسن کے چہرے پہ کوئی تاثر نہ تھا ــــ بس ایک جامد سرد خاموشی تھی۔

"جب وہ بات ہوئی تھی نا ــــ مذہب بدلنے والی ــــ پھر ہم نے ایک دوسرے سے کوئی رابطہ نہیں رکھا ــــ دو ماہ بعد ہی اس نے ایک انتہائی آوارہ، عیاش مگر رومن کیتھولک لڑکے سے اپنے والدین کی خواہش کے مطابق شادی کر لی۔ اس کی بہن اکثر مجھے فون کرتی، روتی، فریاد کرتی کہ احسن خدا کے لئے ٹیسی کو سمجھاؤ، اس قدر پینے لگی ہے کہ اسے اپنا ہوش ہی نہیں رہتا۔ مگر ٹیسی سے بات نہ ہوئی ــــ پھر صہبا ــــ

ایک روز وہ اپنے شوہر کو لے کر اپنا شہر چھوڑ گئی ـــ بغیر اپنا پتہ نشان بتائے۔ تعلیم چھوڑ دی نوکری چھوڑ دی ـــ ماں باپ کو چھوڑ دیا ـــ بہن بھائی شہر سب کو چھوڑ دیا ـــ پھر ابھی چار مہینے پہلے کی بات ہے ـــ اپریل کا مہینہ تھا شاید ـــ ایک روز میرے دفتر میں نیوجرسی سے فون آیا ـــ وہاں کے کسی ہسپتال کے ڈاکٹر کا فون تھا ـــ اس نے بتایا کہ ٹیسی نام کی ایک لڑکی گاڑی کے حادثے میں شدید زخمی ہو کر آئی ہے اور اس کی ڈائری میں آپ کا نام اور فون نمبر لکھا تھا ـــ میں نے بغیر مزید کچھ سنے فون بند کر دیا۔

اور بدحواس ایئرپورٹ پہنچ گیا ـــ اور جب میں ڈاکٹر کے بتائے ہوئے ہسپتال میں پہنچا تو ـــ ٹیسی مر چکی تھی ! ـــ وہ دنیا کے ہر رشتہ اور مذہب سے آزاد ہو چکی تھی ـــ احسن کی نم آواز خاموش ہو گئی۔

" احسن ـــ کیا محبت کرنے والے اس طرح مر جاتے ہیں ؟" مجھے اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی۔

" نہیں صہبا ـــ محبت کرنے والے میری طرح بھی مرتے ہیں لمحہ لمحہ ـــ میری طرح پگھلتے ہیں ـــ بوند بوند !" ـــ اور میرا ہنستا کھلکھلاتا بہادر بھائی ایک دم ہی سسک پڑا ـــ !!!

اسلام آباد ۱۹۸۵ء

گرہن

"بابا۔ آپ بالکل آرام نہیں کرتے ـــــ سارا دن لکھا کرتے ہیں اور شام میں عائشہ کو لے کر گھمانے چلے جاتے ہیں! ـــــ اگر یہی کرنا تھا تو پاکستان ہی میں رہتے! ـــــ بیٹی کی پیار بھری تنبیہہ پر میں زور سے ہنس دیا۔

"بیٹا ـــــ جس شخص نے چالیس برس تک دن اور رات کاغذ قلم سے ناطہ جوڑے رکھا بھلا وہ اپنی عادتیں یک لخت کیسے بدل سکتا ہے؟" ـــــ میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"پاکستان میں آپ جو چاہے کیجئے ـــــ مگر یہاں نہیں چلے گا یہ لکھنا وکھنا ـــــ بس آرام کیجئے!" ـــــ اس نے میرے ہاتھ سے قلم لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی ـــــ بالکل نہیں لکھوں گا مگر یہ خط تو پورا کر لینے دو" ـــــ میں نے کہتے ہوئے قلم اٹھا لیا۔

"بابا! آپ نہیں مانیں گے!" ـــــ اس کی آواز میں احتجاج تھا۔

"کہہ تو دیا کہ یہ خط پورا کر لوں ـــــ بہت ضروری ہے ـــ پھر نہیں لکھوں گا!" میری آواز میں پدرانہ سنجیدگی آ گئی تھی ـــــ وہ زور سے ہنس پڑی۔

"ٹھیک ہے ـــــ میں کھانا پکارنے جا رہی ہوں جب تک آپ یہ خط مکمل کر لیجیے!" یہ کہتی ہوئی وہ میرے کمرے سے نکل گئی اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

مجھے ڈلاس آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو چکا تھا۔۔۔۔ آیا تو میں یہاں آرام کی خاطر تھا مگر سچی بات یہ ہے کہ یہاں آکر خود کو مقید سمجھنے لگا تھا۔۔۔۔ واقعی اگر یہ قلم کا غذ نہ ہوتا تو میں پاگل ہو چکا ہوتا۔۔۔۔ دو ماہ قبل اچانک ہی نہ جانے کیسے دل کا عارضہ ہو گیا۔ شاید اندرونی دکھ کے اظہار کی یہ ایک شکل تھی۔ جب سے میری چہیتی بیوی اللہ کو پیاری ہوئی تھی نہ جانے زندگی بالکل بے کار سی کیوں ہو گئی تھی۔ اس کی موت کے بعد میں اپنے آپ کو لاوارث سمجھنے لگا تھا۔۔۔۔ مرد کی نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے خصوصاً بوڑھے مرد کی۔۔۔۔ باوجود اس کے کہ میں صبح سے شام تک اخبار کے دفتر میں رہتا تھا مگر ایک خالی پن کا احساس زندگی پر چھا گیا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہی ہے اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی کی دوری کا بھی احساس نہ تھا۔۔۔۔ مگر اس کی موت نے اچانک ہی بہت سے بھولے ہوئے رشتے یاد دلا دیئے تھے۔ اور جب میری بیٹی کو میری بیماری کی اطلاع ملی تو وہ دوڑی ہوئی میرے پاس چلی آئی اور اس وقت اس کی ضد پر آج یہاں موجود ہوں۔ بیٹی کے اس وقت کے عمل نے مجھے شدت سے اپنی بیوی کی یاد دلا دی تھی وہ بھی تو بالکل اسی کی طرح میرے زیادہ لکھنے لکھانے پر ناراض ہوا کرتی تھی اور جب میں مصنوعی سنجیدگی طاری کر لیتی تو بالکل اسی طرح زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنی ہم چشموں میں بیٹھ کر کس فخر سے کہا کرتی تھی:

"میرے شوہر تو صحافی ہیں!"

میں نے ایک روز اس سے کہا:

"زینب۔۔۔۔ یہ صحافی ہونا کمال کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو دنیا ہی میں سزا دینا چاہتے ہیں۔ اس کی تقدیر میں صحافت کا پیشہ لکھ دیتے ہیں"۔۔۔۔ اور وہ حسب عادت زور سے ہنس پڑی تھی۔

"تو اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ سب سے بڑے صحافی تو اللہ میاں ہوئے نا۔۔۔۔ جو لکھنے لکھانے کا کام کرتے ہیں۔۔۔۔ اس نے ہمیں دین دنیا کی خبر دی اور آپ لوگ دین دنیا

کے مسائل کی خبر دیتے ہیں!" ـــــ اور میں اس کی عقل مندی پر عش عش کر اٹھا۔ ایک روز نہ جانے کس بات پر ایڈیٹر سے میرا جھگڑا ہو گیا اور فیصلہ کر لیا کہ صحافت کی حماقت چھوڑ کر کہیں نوکری کروں گا۔ جب زینب کو پتہ چلا تو کچھ دیر تو سوچتی رہی پھر بولی۔ "شاید ـــــ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں ـــــ دیکھئے تو آپ کا پیشہ کس قدر الوہی ـــــ کتنا مقدس ہے ـــــ ہمارے مذہب کی تو شروعات اسی سے ہوئی پھر صحیفے تو آسمانی تحریریں تھیں ـــــ ہر آدمی ان کا اہل ہوتا بھی نہیں اور اب اتنے برس آزادی کی زندگی گزارنے کے بعد جی حضوری آپ کر سکیں گے؟؟" ـــــ

اور اس کی لاجواب دلیل سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ کہتی تو سچ ہی ہے بھلا اب میں کس کام کے لائق رہ گیا تھا! ـــــ حقیقت تو یہ ہے کہ اس جنونی کام میں سکون بخشنے والی ـــــ ہمت دلانے والی زینب ہی تھی ـــــ پھر چند برس قبل جب میں نے اپنا اخبار نکالا تو آدھے سے زیادہ کام اس نے سنبھال لیا تھا۔

"بابا ـــــ آپ ابھی تک لکھ رہے ہیں؟ ـــــ رابعہ کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ وہ شاید اپنا کام نمٹا چکی تھی۔

"ایں ـــــ نہیں تو ـــــ بس پتہ نہیں کیوں آج تمہاری امی کی یاد شدت سے آگئی!" ـــــ میں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور میرے اخبار کے بارے میں باتیں کرنے لگی ـــــ کتنی عقل مند ہے میری بیٹی ـــــ بالکل اپنی ماں کی طرح ـــــ کوئی بوجھ بھی تو ذہن پر رہنے نہیں دیتی!

"نانا ـــــ باہر چلو ناں!" ـــــ میری نواسی عائشہ بہت دیر سے ضد کئے جا رہی تھی اور میں اسے بہلائے جا رہا تھا کہ بس ابھی دو منٹ میں چلتے ہیں ـــــ آج صبح ہی یہاں کے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی اس پر کالم لکھ رہا تھا۔

"عائشہ ـــــ بیٹے ادھر آجاؤ ـــــ نانا کو پریشان مت کرو!" ـــــ میرے داماد نے دروازے سے بیٹی کو پکارا۔

"ارے نہیں بیٹا ـــــ روز میرے ساتھ جاتی ہے اس کارڈین مت توڑو !ـــــ
یہ کہہ کر قلم ایک طرف رکھ دیا اور عائشہ کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔
"نہیں بابا ـــــ رہنے دیجئے میں لیے جاتا ہوں !"ـــــ میرے داماد نے کہا۔
"نہیں یار !ـــــ میں بھی لکھتے لکھتے تھک چکا تھا ـــــ کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا قلم رکھنے کا ـــــ سو مل گیا !"ـــــ میں نے کہا اور عائشہ کو لے کر باہر نکل گیا۔

ہم دونوں کافی دیر گھومتے رہے ـــــ وہ اپنی توتلی زبان میں دنیا جہان کی باتیں کرتی رہی ـــــ گڑیوں کی ـــــ اپنی سہیلیوں کی ـــــ اس اسکول کی جہاں چند ماہ بعد اس کا داخلہ ہونا تھا ـــــ اور میں پوری محویت سے اس کی ٹوٹی پھوٹی گفتگو سنتا رہا۔ عائشہ چند بچوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے دور نکل گئی تھی ـــــ میں ایک خالی بنچ پر اپنی سوچوں میں بیٹھا تھا۔

"آپ یہاں نئے ہیں ؟ ؟"ـــــ ایک نسوانی آواز پر میں چونک کر مڑا۔ میری ہی عمر کی ایک عورت تھی ـــــ صاف ستھری ـــــ روشن آنکھوں والی ـــــ ایک بچہ گاڑی میں خوبصورت سے بچے کو لئے ہوئے۔

"جی ہاں !"ـــــ میں نے مختصراً کہا۔

"مجھے مسز روبیل کہتے ہیں !"ـــــ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"اور میرا نام شاہد حسین ہے !"ـــــ میں نے کہا۔ عائشہ دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

"نانا ـــــ گھر چلو !"ـــــ اس نے مچل کر کہا۔

"چلو !"ـــــ میں کھڑا ہو گیا۔

"مسز روبیل یہ میری نواسی ہے عائشہ ـــــ آپ کبھی میرے گھر تشریف لائیے وہ سامنے اوپر سے دوسرا فلیٹ ہے !"ـــــ میں نے فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بڑی پیاری بچی ہے ـــــ اچھا ـــــ میں ضرور آؤں گی !"ـــــ اس نے

عائشہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت سے کہا اور بچہ گاڑی لئے ایک طرف چل دی۔

مسز روبیل کو میں نے اکثر پارک میں دیکھا تھا — مگر کبھی اس کے بارے میں خیال تک نہ آیا — آج جانے کیوں اس کے بارے میں تجسّس پیدا ہوا کہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کہاں جاتی ہے؟ — بچہ گاڑی میں پڑے خوبصورت اور توانا بچے سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ — مگر پھر کئی روز تک وہ نظر نہیں آئی۔

بدھ کا دن تھا — رابعہ عائشہ کو لے کر بازار گئی ہوئی تھی اور میں پاکستان سے آئے ہوئے اخبارات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ گھنٹی بجی — یہ سوچ کر کہ میری بیٹی بازار سے آگئی ہوگی۔ اٹھ کر دروازہ کھولنے چلا گیا — سامنے مسز روبیل کھڑی تھی۔

"ہیلو!" — اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہیلو — تشریف لائیے!" میں نے ایک طرف راہ دیتے ہوئے کہا۔

"آپ اکیلے ہی رہتے ہیں؟" — اس نے کمرے پر طائرانہ نظریں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں فی الحال تو اکیلا ہوں — میں نے صوفے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ یہاں قریب ہی رہتی ہیں؟" — میں نے ایک طرف بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں — میں تو یہاں سے کافی دور رہتی ہوں — بس ہفتہ میں ایک بار ادھر آتی ہوں!" — اس نے اپنے سلیقہ سے سنورے ہوئے کھچڑی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا۔

"اچھا! — چائے پیجئے گا یا کافی؟" — میں نے پوچھا۔

"ارے تکلف نہ کیجئے — اس روز چونکہ میں نے آپ سے کہہ دیا تھا اس لئے آگئی ہوں — ویسے بھی اس عمر میں آدمی کے پاس کرنے کو کچھ رہتا نہیں ہے —

مجھے ہی دیکھئے ـــــ بدھ کے انتظار میں پورے سات دن گزارتی، ورنہ میرے گھر میں ہے کون بس دو کمرے، ایک خاموش گیلری اور میں!" اس نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں واقعی ـــــ بڑھاپے میں آدمی بالکل تنہا رہ جاتا ہے ـــــ لیکن خود کو اگر کسی کام میں لگالے تو وقت گذرہی جاتا ہے !" ـــــ میں نے کہا۔

"آپ بھی یقیناً" ریٹائرڈ" زندگی گزار رہے ہیں ؟" ـــــ اس نے میری طرف دیکھتے ہوتے پوچھا۔

"ارے نہیں ـــــ اخبار والے مرتے دم تک ریٹائر نہیں ہوتے !" ـــــ میں نے ہنس کر کہا۔

"اوہ آپ صحافی ہیں ؟ ـــــ بہت عمدہ ! ـــــ بڑا باعزت پیشہ ہے !" ـــــ اس کے لہجہ میں خوشی تھی۔

"جی ہاں ـــــ عمدہ بھی اور بہت تھکا دینے والا بھی !" ـــــ میں نے کہا۔

"زندگی کے لئے تھکن بہت ضروری ہے ـــــ بلکہ زندگی کو جینا ہے تو تھکنا لازمی جزو ہے ! اب میرے پاس کوئی کام نہیں اس لئے زندگی خالی خالی سی لگتی ہے !"۔ اس کی آواز میں مجھے درد کی ہلکی سی لہر کا احساس ہوا۔

"تو ہر بدھ کو آپ اپنے گھر سے یہاں کیا کرنے آتی ہیں ؟ ؟" ـــــ میرا تجسس جاگ اٹھا۔

"او ـــــ وہ ! ـــــ بس وہی تو ایک کام ہے جس کی وجہ سے زندگی میں کچھ ہلچل ہو جاتی ہے ـــــ میں یہاں ہر بدھ کو بے بی سٹنگ کے لئے آتی ہوں ایک روز کا معاوضہ بیس ڈالر لیتی ہوں !" ـــــ اس نے بتایا۔

"اوہ ـــــ اچ ـــــ چھا ! ـــــ جانے کیوں مجھے اس کی اس بات پر حیرت کے ساتھ ترس بھی آ گیا۔

"اور کیا ـــــ اچھا آپ بتایئے کہ آپ کس اخبار میں ہیں ـــــ کس قسم کا اخبار ہے ؟ ـــــ کہاں سے نکلتا ہے ؟ ـــــ اس کے لہجہ میں چند لمحوں پہلے کی اداسی

کی جگہ دلچسپی نے لے لی تھی ۔

"میرا اخبار تو پاکستان میں ہے اور وہیں رہتا ہوں ـــــ ادھر تقریباً ایک ڈیڑھ ماہ سے اپنی بیٹی کے ہاں آیا ہوا ہوں !" ـــ میں نے بتایا۔

" اوہ ـــ تو یہ آپ کی بیٹی کا گھر ہے ؟" ـــ اس کی آواز میں اب کوئی تاثر نہ تھا۔

"ہاں ـــ وہ ذرا بازار تک گئی ہوئی ہے ـــ بہت ممکن ہے آپ کے جانے سے پہلے آجائے تو آپ سے بھی ملاقات ہو جائے گی !" ـــ میں نے کہا ـــ وہ چند لمحے مجھے غور سے دیکھتی رہی ـــ اس کی روشن آنکھوں میں دھندسی اُتر آئی تھی - چہرے پر اداسی پھیل گئی تھی ۔

" اچھا ـــ آپ پاکستان سے آئے ہیں ـــ اچھا ـــ بیٹی کے گھر ـــ تو ...... تو ...... وہ آپ کو کتنے ڈالر فی یوم کے حساب سے دیتی ہے ؟؟؟

اسلام آباد ۸۶ء